پندرہ روزہ
تعمیرِ حیات
لکھنؤ

حالاتِ حاضرہ سے

"نہ میں متعجب ہوں اور نہ مایوس" یہ حالاتِ زندگی کی علامت ہیں لیکن ...."

مسلم مکتب یوتھ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام الٰہ آباد کے ایک مخلوط اجتماع میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے "موجودہ حالات میں ہماری سوسائٹی کیا رول ادا کر سکتی ہے" اس موضوع پر تقریر فرمائی۔ جلسے میں ہزاروں کی تعداد میں مسلم اور غیر مسلم تعلیم یافتہ طبقہ کے افراد شریک تھے پوری تقریر بڑی توجہ سے سنی گئی اور ہر ایک نے اپنی دل کی آواز محسوس کیا۔ افادۂ عام کی غرض سے یہ تقریر ٹیپ ریکارڈ سے قلمبند کر کے شائع کی جا رہی ہے۔

(مرتب: سعید الحسن الٰہ آبادی متعلم ندوہ)

o o o

بعض اوقات برسوں بعد ایسا زمانہ آتا ہے کہ انسان کسی شدید بیماری سے دوچار ہوتا ہے، یوں تو انسان بیمار ہو کر، اچھا ہو کر، بھوکا ہو کر بھوک کا اظہار کر کے کھانا کھا کر اپنی انسانیت کا اظہار کرتا ہے اور اپنی انسانیت کا ثبوت دیتا ہے لیکن جس کو بحرانی کیفیت کہتے ہیں، بیماری کا حملہ کہتے ہیں اور پوری انسانی سوسائٹی جس کا شکار ہو، وہ کبھی صدیوں کے بعد ہوا کرتا۔ بعض مخصوص اسباب کی بنا پر کچھ عوامل ایسے ہوتے ہیں جو بیشتر کام کرتے رہتے ہیں، اس وقت لوگوں کو خیال نہیں ہوتا کہ وہ کیا عمل کر رہے ہیں، ان کو آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے! بہت سے لوگ ان پر نوٹس لینے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں لیکن یہ عوامل یہ Factors اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور پھر وہ کام کرتے کرتے جس طریقہ سے ہر چیز کی ایک تدریجی منزل ہوتی ہے وہ ایسی Develop ہوتی ہے کہ اس کا حملہ بیماری کی طرح ہوتا ہے اور وہ اچانک ہی ہوتا ہے اور بہت شدید ہوتا ہے۔ آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ یہ مصیبت کہاں سے آئی۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا ہے اس کا مادہ جو کئی دنوں سے تیار ہو رہا تھا انسان کا جسم اس کی موافقت کرنے سے اس کو Reject کرنے سے اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھا اس کے سامنے ہتھیار ڈال چکا تھا، یہاں تک کہ اس بیماری کا پوری طرح قبضہ ہو گیا۔

حالات غیر معتدل اور غیر معمولی،

تو اس وقت جو حالات ہمارے ملک اور پوری دنیا میں رونما ہیں وہ غیر معتدل اور غیر معمولی ہیں لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں اور آپ جیسے سمجھ دار حضرات تعلیم یافتہ ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ حالات اچانک ایکسیڈنٹ کی طرح رونما نہیں ہوئے بلکہ یہ ارتقا کا Evolution کا نتیجہ ہیں جو بیسیوں برس سے کام کر رہا تھا۔ ان بیماریوں کی رفتار کروٹیں بدلتی رہتی ہے بعض مرتبہ موٹر کی رفتار سے تو بعض مرتبہ انجن کی رفتار سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔

اس وقت جو بنیادی حالات ہمارے ملک کو درپیش ہیں یہ اچانک نہیں پیدا ہو گئے، آپ کو شاید تعجب ہو یا آپ اسے خلاف توقع بات سمجھ رہے ہوں لیکن میں اس پر کسی حیرت و استعجاب کا اظہار نہیں کرتا ——— مجھے ان حالات سے بالکل تعجب نہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ میں ان حالات سے مایوس بھی نہیں اور مجھے ان سے زیادہ تکلیف بھی نہیں، یہ حالات تو میرے نزدیک زندگی کی علامت ہیں، یہ حالات تو پیدا ہوتے رہتے ہیں اور رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ہماری تاریخ کا جتنا ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے یہ خود بتاتا ہے کہ انسان فرشتوں کی طرح یا بے نفس انسانوں کی طرح، جس کے اندر شر کی صلاحیت ہی نہ ہو بلکہ وہ خیر مجسم بنایا ہوا، اس کے اندر سوائے خیر خواہی اور خیر طلبی کے کوئی صلاحیت ہی نہ ہو تاریخ میں ایسا کوئی دور نہیں گزرا۔ اگر گزرا بھی ہے تو وہ کسی پیغمبر کی کوشش، کسی بڑے مصلح کے تگ و دو سے۔ لیکن اس کا رقبہ بھی محدود تھا اس کا زمانہ بھی محدود تھا۔ یہ نہیں رہا کہ صدیوں تک یہ صورت حال قائم رہی ہو اور ساری دنیا پر، پورے کرۂ ارضی پر اس کا اثر ہو۔ ایسا نہیں ہوا۔ عموماً ہر زمانے میں اکثریت متوسط درجے کے لوگوں کی رہی ہے Genius قسم کے لوگ ہر دور میں بہت کم ہوتے ہیں اور اس زمانہ میں بھی کم ہیں۔

ہمارے ملک میں جو اس وقت انتشار ہے، دولت پیدا کرنے کا جنون ہے۔ اس وقت جو خود غرضی ہمارے اوپر چھائی ہوئی ہے۔ اس وقت جو دولت کی پیاس اور بھوک اس قدر بڑھ گئی ہے کہ آدمی دیوانہ ہو گیا ہے اس وقت جو کرپشن پھیلا ہوا ہے۔ اس وقت ذخیرہ اندوزی کا جو دور دورہ ہے اس وقت نفسی نفسی کا جو دور دورہ ہے، فرض شناسی کا فقدان ہے، اس وقت دیانت و امانت کا فقدان ہے اور اپنے فرض کا کوئی احساس نہیں۔ مجھے اس پر تعجب نہیں ہے، مجھے اس پر زیادہ دکھ بھی نہیں ہے میں اس صورت حال سے بالکل مایوس نہیں ہوا۔

میری بات خلاف توقع ہوگی،

میں عرض کروں گا کہ میری یہ بات آپ لوگوں کو بالکل خلاف توقع ہوگی میں گویا جان بوجھ کر اپنے کاز کو نقصان پہونچا رہا ہوں۔ میری اس وقت یہاں حاضری کا جو مقصد ہے اسے نقصان پہونچا رہا ہوں۔ میں گویا وکیل حریف کے حامی دلائل بیان کر رہا ہوں۔ آپ کے الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج جسٹس محمود کے متعلق

←

بقیہ:

پر یہ چڑھاوا دیتے ہیں۔

یہی مرض پیدا ہو گیا ہے: یہ جو مرض کچھ دنوں سے ہمارے ملک میں بھی پیدا ہو گیا ہے، یہ مرض بڑا مہلک و خطرناک ہے

اور جو کچھ آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، عام زندگی پر جو کمزوری اور بے اعتمادی ہے سب کچھ ہوتا ہو نہ ہو کچھ نہیں ملا ہے ہمیں اس پر پریشانی اتنی افسوسناک نہ ہوتی اگر یہ ملک خدا کی ملک نہ ہوتا! میرے غم نہ ہونے پر اتنا افسوس نہ ہوتا، اگر ہمارے اس ملک کے وسائل محدود ہوتے، یہاں کھیتی نہ ہوتی، اتنا بڑا ملک بنجر سا ہوتا، آبادی بہت لیکن ملک چھوٹا سا ہوتا، اگر ہمارے ملک میں قدرت کی عطیات اور اللہ کی نعمتیں نہ ہوتیں جیسا کہ یورپ کے بہت سے ملکوں میں، وہاں سب کچھ مگر پیداوار بہت کم ہوتی ہے، آپ وسط یورپ جائیے آپ کو وہاں ایسے چھوٹے چھوٹے ملک ملیں گے کہ جنکے پیداوار و وسائل کی بہت کمی ہے، لیکن اسکے باوجود وہاں یہ بے چینی و قلق نظر نہیں آتا ہے۔

آپ ہی بتائیے آپ ہی سے پیارا بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں کہ ہمارا ملک کسی ملک سے کم نہیں ہے؟ کیا یہاں وسائل زندگی کی کمی ہے؟ کیا یہاں دریا و ندیاں کم ہیں؟ کیا یہ ایک غریب اور چھوٹا سا ملک ہے؟ ہمارے ملک میں کس چیز کی کمی ہے، قدرت کی قدرت، خدا کی سخاوت نے اس ملک کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کو قدرتی خزانوں سے مالا مال کر دیا ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں یا کہتے ہیں کہ اس ملک کی ابتری، غذائی وحشت، اور دوسری تکلیف دہ چیز زندگی کی کمی کی وجہ سے ہے تو میں انکو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اس ملک سے واقف نہیں ہیں انکو اپنے ملک کی قدر نہیں۔ انہوں نے اپنے ملک کو دیکھا نہیں ہے میں نے اس ملک کو خوب دیکھا ہے شاید اس مجمع میں کم ہی آدمی ہونگے جنہوں نے میری طرح اس ملک کی سیاحت کی ہے میں نے مختلف اسباب کی بنا پر اس ملک کو چھان ڈالا ہے مجھے سیر و سیاحت کا شوق بھی ہے اور اسکے مواقع بھی ملتے رہے ہیں۔ اور بعض وفود کے ساتھ بھی دورہ کرنا پڑا تو حیران رہ گیا کہ اللہ اکبر کتنا حسین و دلکش ملک خدا نے ہمکو عطا کیا ہے۔ یورپ میں مجھے یاد ہے کہ اگر آدمی وہاں بے احتیاطی کرے موٹر ذرا تیز چلائے تو اسکو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے حدود کو چھوڑ کر دوسرے ملک کی سرحد میں داخل ہو جائے۔

جنیوا کا ایک واقعہ: مجھے یاد ہے کہ جنیوا میں ہم لوگ شام کو ہوا خوری کے لئے گئے۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر حمید اللہ بھی تھے جو ہندوستان کے بہت بڑے اسکالر، وہ حیدرآباد کے رہنے والے تھے ہندوستان کو تو ان پر فخر ہونا چاہئے۔ اس وقت وہ ماشاء اللہ فرانس کے شہری ہیں) وہ ہمارے ساتھ تھے ایک جگہ جا کر ہم کھڑے ہوئے باتیں کرتے کرتے ذرا ہم آگے بڑھ گئے، انہوں نے کہا بس یہیں رہئے آگے قدم رکھیں گے تو فرانس پہونچ جائینگے اور وہاں سے واپس نہ آ سکیں گے۔ معلوم ہوا ہے کہ جنیوا کے ہوائی اڈہ کا کچھ حصہ فرانس کے حدود میں ہے۔ اور کچھ حصہ سوئٹزرلینڈ میں، یہ تو ان ملکوں کی حقیقت ہے اگر آپ وہاں بے تحاشا موٹر چلائیں تو آپ ملک کی سرحد پار کر جائیں گے اور آپ کو اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔

وسائل سے مالا مال ملک: برخلاف اسکے آپ اس ملک کو دیکھیں یہ کتنا اس کا رقبہ اور کتنا وسیع ملک ہے پھر اگر ان باتوں کا کوئی شک باقی ہو تو آپ کو اس ملک کی حقیقت معلوم ہو جائیگی۔ اب اگر اس ملک میں غذائی کمی ہوتی یا اس ملک میں صلاحیت نہ ہوتی یا اس ملک میں قدرتی پیداوار نہ ہوتی یا اس ملک کے لوگ ذہانت سے محروم ہوتے، لیاقت و صلاحیت سے محروم ہوتے تو کچھ تسلی ہو جاتی، اور ہم سمجھتے کہ ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے، لیکن اللہ کی طرف سے کوئی کمی نہیں ہے بلکہ اس ملک کو سب کچھ دیا ہے اسکی جھولی بھر دی ہے اس ملک کا دامن پر کر دیا ہے اسباب بھی سب ہے کہ اس کو اٹھانا مشکل ہو گیا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں

تو دوسری اس ملک کے لئے مصیبت بن گئی ہو کون سی چیز اس ملک کی طرف لائی، ترکوں اور مغلوں کو دین کے جذبہ نے اس پر آمادہ کیا تھا میں انکو مانتا ہوں لیکن یہ ملک سونے کی چڑیا تھی ان کا بھی جی چاہتا تھا کہ جائیں اور حکومت کریں اور اپنی زبان کے نوالے کھائیں۔ اس ملک کی بھی خدمت کریں۔ انگریز یہیں پچیس برس تک رہتے ہیں۔ دولتیں یہیں آ گئیں۔ وہ کون سی بات تھی کہ انکا وطن تھا، وہ کون سی کمی تھی انکو انکے لئے غیر ملکی دیکھ کر آتا یا جائے اخبارات کے فائل دیکھ کر بتایا جائے کہ معلوم ہوا کہ یہاں کی سب دولت ختم ہو گئی ہے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ پریشانی کیوں؟ کیا یہ پریشانی اس وجہ سے ہے کہ ملک غریب ہے، اس ملک میں خاک اڑ رہی ہے، کیا اس وجہ سے کہ یہاں کے لوگ کھانا چاہتے ہیں، پہننا چاہتے ہیں لیکن کمانا نہیں چاہتے۔ نہیں یہ بات نہیں ہے، بلکہ اللہ نے یہاں کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی اسی لئے کی ہے کہ خود کھائیں لیکن اسکے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی کھلائیں خود پہنیں اور دوسروں کو بھی پہنائیں لیکن کیا بات ہے کہ یہاں بیشمار افراد کو دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی، پہننے کیلئے کپڑا نصیب نہیں ہوتے۔

یہ عشق یہ جنون: میری بات یہ ہے کہ دولت کا عشق، دولت کا جنون لوگوں پر سوار ہے۔ عشق آپ جانتے ہیں کہ اندھا ہوتا ہے۔ حکومت حاصل کرنے کا جذبہ بھی غیر فطری نہیں ہے۔ میرا یہ کہنا حقیقت پسندی کے بالکل خلاف ہوگا کہ انسان میں حکومت حاصل کرنے کا جذبہ ہی نہیں ہونا چاہئے لیکن جب حکومت حاصل کرنے کا عشق اس حد تک پہونچ جائے کہ اسے کچھ پرواہ نہ ہو کہ اسکے اس فعل سے ملک پر کیا گذر رہی ہے اور لوگ مر رہے ہیں یا جی رہے ہیں، سارا ملک لاشوں میں تبدیل ہو جائے مگر ہماری کرسی محفوظ رہے، یہ بالکل غیر فطری جذبہ ہے، یہ شیطانی و حیوانی جذبہ ہے، یہ فرد و جماعت اور تمام ملک کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔

اگر کوئی حکومت حاصل کرنا چاہتا ہے، اسکے نزدیک ملک کو ترقی دینے کے جو اصول ہیں انہیں بروئے کار لانا چاہتا ہے اور اسے کامیاب بنانا چاہتا ہے اسکے ذریعہ سے اگر اپنے ہم وطنوں کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو وہ قابل مبارکباد ہے، شوق سے خدمت کرو، لیکن جب اسکے اندر یہ جذبہ جنون اور عشق کی حد تک پہونچ جائے انہیں انفرادیت اور ترقی کر جائے، انانیت اس میں اسقدر پیدا ہو جائے کہ وہ سب کی نفی کرے۔ اسکے نزدیک اگر کسی انسان کی قیمت ہے تو ووٹر کی قیمت ہے، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہمارے یہاں الیکشن کی یہی حالت رہی تو وہ وقت آنے والا ہے جبکہ آدمی کے نزدیک ماں کی عظمت اسی وقت ہوگی جبکہ اسکی قدر اسی وقت کرےگا جب وہ ووٹر ہو اور بیٹے کو محبت کے قابل اسی وقت سمجھا جائیگا جبکہ وہ ووٹر ہو، اگر انسان ووٹر نہیں ہے تو بے عقل اور بے منفعت ہے وہ اگر مر جائے تو اسکا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ اب وہ وقت آنیوالا ہے جب کسی کو معلوم ہوگا کہ فلاں محلہ میں فلاں شخص مر گیا ہے تو وہ پوچھیگا کہ وہ میرا ووٹر تو نہیں تھا، اگر معلوم ہو گیا کہ وہ اسکا ووٹر نہیں تھا تو اسکی موت کا اسے کوئی صدمہ نہ ہوگا۔ تو جب ساری دلچسپیاں، سارے احساسات سمٹ کر الیکشن کی سیاہ کوٹھی میں آ جائیں تو انسان اسی کی عینک سے ہر چیز کو دیکھےگا اور اسی کے کان سے ہر چیز کو سنےگا، اسی کے ہاتھ سے ہر چیز کو چھوئےگا تو پھر اس ملک کے لئے اس سے زیادہ خطرہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

میں اپنی آواز نہیں پہونچا سکتا: حضرات! مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی آواز ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہیں پہونچا سکتا ہوں، میری قوت بھی محدود ہے اور میرے وسائل بھی اور مجھ پر ایک حجاب لگی ہوئی ہے

جیسے کہ ابھی میرے ایک دوست نے کہا ہے کہ میں ایک مذہبی شخصیت سمجھا جاتا ہوں۔ تو میں مذہبیات انسانیت کی کہوں، واقعات و روزمرہ کی زندگی کی کہوں، لیکن میرے اوپر تو ایک ٹھپہ لگا ہوا ہے کہ میں ایک مذہبی آدمی ہوں میں اس سے برأت نہیں کرنا چاہتا ہوں اور نہ دفاع کرنے کو تیار ہوں بلکہ میں اسکو قبول کرتا ہوں لیکن اسمیں ایک وجہ ہے کہ میری بات کو ٹھنڈے دل سے سننا چاہئے ایک ایسے انسان کی بات جو انسان کے مسئلہ کو لیکر کھڑا ہوا ہے اس میں فرق ہو جاتا ہے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نہ جانے کہاں سے یہ آدمی موڑ دیگا اور تبلیغ کی بات شروع کر دیگا، معلوم نہیں کہاں سے اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے لگے گا تو جائز، اگر الیکشن میں ایک آدمی خلاف ہر مکتب اور اپنے پارٹی کی حمایت کر سکتا ہے تو میں جس مذہب کو صحیح سمجھتا ہوں اگر اسکی تبلیغ کروں تو کیا برا ہے لیکن اس وقت میں تبلیغ نہیں کروں گا، یہ موقع اسکا نہیں ہے اور آپ سب پڑھے لکھے لوگ ہیں میں جو باتیں کہونگا وہ آپکے لئے جانی بوجھی ہونگی۔ تو مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی آواز ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہیں پہونچا سکتا لیکن آدمی اگر کسی سے نہ کہہ سکے تو کیا اپنے گھر والوں سے بھی نہیں کہہ سکتا ہے اگر وہ اپنے دوستوں سے بھی نہ کہہ سکے تو وہ گھٹ گھٹ کر مر جائیگا۔ اس لئے میں کبھی کبھی اپنی زندگی باقی رکھنے کے لئے ایسے سننے والے کان اور ایسے دردمند دل چاہتا ہوں جو میری باتوں کو سنیں اور غور کریں۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ اس وقت جو چیز اس ملک کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہے وہ ہمارا اجتماعی مفاد کو یکسر نظرانداز کرنا ہے۔ ایک سوسائٹی جب ہی اچھی زندگی گذار سکتی ہے جب اسکے ہر فرد کو کھانے کو ملتا ہو اور سب کی ضروریات زندگی پوری ہوتی ہوں، جب سب ایک دوسرے پر اعتماد رکھتے ہوں جب سب ایک دوسرے سے گھبراتے نہ ہوں، ایک دوسرے کو دشمن نہ سمجھتے ہوں، سانپ بچھو نہ سمجھتے ہوں، لیکن آجکل ہمارے معاشرہ میں کیا چیزیں پیدا ہو گئی ہیں۔ خاص طور پر ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ دور رس نتائج نہیں بلکہ قریبی نتائج سے بے پرواہ ہو گیا ہے۔

طلباء کی بے راہ روی: حالت تو اب یہ ہو گئی ہے ہمارا اسکول کا طالب علم اسکی پرواہ نہیں کرتا کہ اس ٹرین پر بیٹھے ہوئے مسافروں کو کب پہونچنا ہے کوئی اپنی بیمار ماں کو دیکھنے جا رہا ہے کوئی جاں بلب باپ کو دوا دینے کے لئے جا رہا ہے کوئی مصیبت زدہ اپنے گھر جا رہا ہے اس کو اپنے گھر کے لوگوں سے ملنے کا کتنا شوق ہے جلد پہونچے، زنجیر کھینچا، اپنے گاؤں یا قصبے کے سامنے گاڑی ٹھہرا دی، اور اگر باغ نظر آ جائے تو وہاں اتر کر باغ کا ستیاناس کر دیا، اس باغ کو جو نقصان پہونچا سو پہونچا لیکن ان مسافروں پر جو گذری وہ گذری لیکن جب کسی ملک کی یہ حالت ہو جائے کہ اجتماعی مفاد سے بالکل آنکھیں بند کر لی جائیں تو میں پیشین گوئی تو نہیں کرتا لیکن یہ ضرور کہونگا کہ یہاں ترقی کی تمام کوششیں بیکار ہے اور یہ یونیورسٹیاں اور لائبریریاں اور لیبارٹریز اور سائنٹفک تجربے و کتب خانات اور ادب و شاعری کی ساری کاوشیں بیکار و فضول ہیں اگر اس ملک میں یہ مرض اور ترقی کر گیا تو راستے میں چلنا پھرنا مشکل ہو جائیگا ریل پر سفر کرنا دشوار ہو جائیگا دفتروں و کچہریوں سے صاحب برآمد کرنا مشکل ہو جائیگا، اسپتالوں سے دوا لینا اور مریض کو دکھانا مشکل ہو جائیگا، شادیوں اور تقریبات میں شرکت کرنا ناممکن ہو جائیگا، اور آخر میں نوبت یہ آئیگی کہ پیاسے کو پانی نہ ملیگا اور بھوکے کو روٹی نہ ملیگی اس ملک کو سب سے بڑا خطرہ ہے کہ ہر شخص آنکھیں بند کر کے اپنے مطلب کے پیچھے دیوانہ ہو گیا ہے۔ اور چاہتا ہوں کہ رات کو سوؤں اور دن کو کھڑی بن جاؤں۔

(باقی)

پندرہ روزہ
تعمیر حیات لکھنؤ
جلد نمبر ۱۱ — سالانہ: دس روپے
شمارہ نمبر ۱۶ — فی پرچہ: ۴۰ پیسے
شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۲۵ جون ۱۹۷۴ء — جمادی الاخری ۱۳۹۴ھ

اسحاق جلیس ندوی

اہلِ علم اور اصحابِ خیر کی خدمت میں

ندوۃ العلماء کی بنا اس عہد میں پڑی جس میں تازہ دم اور توانا مغرب اور کمزور و شکست خوردہ مشرق کی باہمی کشمکش اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ چکی تھی۔ اس عقلی اور فکری کشمکش میں متعدد تعلیمی اور اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں اور انہوں نے اپنے اپنے دائرہ عمل میں اسلام اور مسلمانوں کی قابل قدر خدمات انجام دیں۔

تحریک ندوۃ العلماء کے دو بنیادی مقاصد تھے (۱) نظام تعلیم کی اصلاح (۲) رفع نزاع باہمی۔ مگر کچھ مدت گذر جانے کے بعد تحریک ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد اور دائرہ عمل میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوتی چلی گئی۔ اس نے متعدد بار اس ملک اور عالم اسلام کے تعلیمی، تہذیبی مسائل میں خود رہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور فکری غذا کے لئے اپنے مقاصد میں ایک ایسے کتب خانہ کا قیام شامل کیا جو کتابوں کی تعداد و تنوع، اور کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مثالی کتب خانہ ہو۔ تحریک ندوۃ العلماء کے استقبال و عروج کا ایک دور وہ بھی تھا کہ جب اس کے سالانہ اجلاس اس ملک کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ قدیم و جدید تعلیم یافتہ اور بااثر عمائدین کے ایسے اجتماعات اس ملک کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی دیکھے گئے۔ تحریک ندوۃ العلماء کی دعوت اور پیام نے نظام تعلیم کی اصلاح اور باہمی تنازعات کے خاتمہ کا احساس دنیائے اسلام میں پیدا کیا۔ علامہ سید رشید رضا مصری اور دوسرے اہل قلم اور مصلحین نے جامعہ ازہر کے نظام تعلیم میں اصلاح کی تحریک کو ندوۃ العلماء کی صدائے بازگشت قرار دیا۔

تحریک ندوۃ العلماء کی تاسیس ۱۳۱۱ھ میں ہوئی۔ اس وقت بانیانِ ندوہ کو اپنی درسگاہ کے قائم کرنے کا خیال نہ تھا بلکہ وہ صرف ہندوستان کے عربی مدارس کے نظام تعلیم اور طریقۂ تربیت کی اصلاح چاہتے تھے لیکن ہندوستان کی قدامت پسند فضا میں جب اس طریقہ و سلسلہ اور راہ اعتدال کا کامیاب تجربہ کی واضح صورت نظر نہ آئی تو خود ندوۃ العلماء نے ایک دار العلوم قائم کیا جس کا ۱۳۱۶ھ میں لکھنؤ کے ایک چھوٹے سے مکان میں افتتاح ہوا۔ چونکہ یہ عمارت دار العلوم کی ضرورتوں کے لئے ناکافی تھی اسلئے کارکنان ندوہ کو اپنی عمارت تعمیر کرنے کا خیال پیدا ہوا اور ۱۹۰۸ء کو لکھنؤ کے ایک پُر فضا مقام پر جو دریائے گومتی کے کنارے واقع ہے۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کی عظیم الشان عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور اوائل ۱۹۱۲ء میں دار العلوم اور دار الاقامہ نیز کتب خانۂ ندوۃ العلماء اس جدید عمارت میں منتقل ہو گئے اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے ساتھ کتب خانۂ ندوۃ العلماء بھی روز بروز ترقی اور وسعت کی منزلیں طے کرتا رہا۔

ندوۃ العلماء کے قیام کو اسی صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے اس مدت میں ندوہ کی زندگی میں ایسے حوصلہ شکن واقعات اور ایسی ایسی آزمائشیں پیش آئیں کہ اگر اس کے قائدین اور کارکنوں کے پائے استقامت کو ذرا بھی لغزش ہوتی تو عجب نہیں کہ عالم اسلام کی اس عظیم الشان دینی تحریک کا خاتمہ ہو جاتا۔ لیکن بانیانِ ندوہ کے اخلاص، تحریک ندوۃ العلماء کی اندرونی مقاومت اور منتظمین ندوہ کی ثبات قدمی اور اس کے مخلصین کے پُر خلوص جذبہ نے اسے ہر گرداب سے بچایا اور ہر طوفان میں محفوظ رکھا۔

ندوہ کے لئے آزمائش کا ایک مرحلہ ماضی قریب کی تاریخ میں پیش آیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان کے مسلمان انتشار اور پریشانی کا شکار تھے، ان کا اور ان کے دینی، ملی، تعلیمی اور ثقافتی مراکز کا وجود اور مستقبل بھی خطرات سے دوچار تھا اسکی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ندوہ جس کی تحریکی سرگرمیاں مدت سے رکی ہوئی تھیں اور وہ صرف دار العلوم و کتب خانہ کے شعبوں میں سمٹ کر رہ گیا تھا، تقسیم ملک کے بعد انہیں بہتر طور پر چلانا اور جاری رکھنا دشوار تھا اس نازک اور پُر آزما موقع پر ملک کے وزیر تعلیم مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی طرف سے حکومتی سطح پر اعانت کی ایک اسکیم پیش ہوئی۔ مولانا ابو الکلام آزاد کو ندوہ سے جذباتی تعلق بھی تھا مولانا آزاد ندوہ میں مولانا شبلی نعمانی کے زیر تربیت عرصہ تک رہ چکے تھے اور الندوہ میں مولانا شبلی نعمانی کے معاون مدیر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔

مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی پیشکش اور ندوہ پر ایسے پُر آشوب دور میں جو عسرت و تنگدستی کا شکار تھا، حکومت کی پیشکش ندوہ کے لئے بڑی امداد ثابت ہوتی، لیکن ندوہ کے بزرگوں نے حکومت کی مستقل اعانت اور فیاضانہ پیشکش کو قبول نہ کیا اور ندوہ کی اصل بنیاد اور اسکی آزادی کو ترجیح دی اور

آزمائشوں کے باوجود دینے سے انکار کیا اور پرواز میں کوتاہی کے اندیشہ کو ان کی خودداری اور درویشی مزاج نے گوارا نہ کیا۔ ندوۃ العلماء ایک تحریک ہے، ندوہ ایک مکتب فکر (School of Thought) کا نام ہے۔ ندوہ توکل اور ایثار کی بنیاد پر ایک جماعت کی تشکیل و تعمیر کا مرکز ہے، اسے کسی عصری اور سرکاری تعلیمی ادارے کا ضمیمہ بنانا ندوہ کے اس دور کے بانیوں کو قبول نہ تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی وہ پیشکش (اگرچہ ان کے اخلاص و ہمدردی پر مبنی تھی) قبول کر لی جاتی تو ندوہ آج لکھنؤ یونیورسٹی کا اور شبلی ڈپارٹمنٹ بن کر رہ جاتا۔ اس کے در و دیوار ان علماء کے لئے ترستے جو مولانا محمد علی مونگیری، مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید عبد الحی صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی کے جانشین بنتے اور ان کی بنائی ہوئی شاہراہ پر گامزن ہو کر قومی اور ملی تعمیر کا سفر کرتے۔

ندوہ نے اس طرح کی مستقل اعانت سے اپنے کو ہر قیمت میں محفوظ رکھا جو آئندہ چل کر اس کے پاؤں کی بیڑی بن جائے اور یہی آج بھی اسکی پالیسی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد کا پھر پور صلہ ندوہ کو ملا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ندوہ نے جو ترقی کی وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ نصاب تعلیم کی اصلاح کا اعلان ندوہ نے روز اول ہی سے کیا تھا مگر اس کی تکمیل ۱۹۵۸ء کے بعد ہوئی۔ آج ندوہ کی تیار کردہ نصاب کی کتابیں ہمارے ملک کی جامعات ہی میں نہیں بلکہ عالم عربی کی معروف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ نئی نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں، طلباء کی تعداد میں اضافہ ہوا اور عالم اسلام میں ندوہ فکر اسلامی کے مرکز اور ندوی برادری دین، علم اور اسلامی ثقافت کی علمبردار ایک معروف جماعت کی حیثیت سے متعارف ہے۔

ندوہ نے دور جدید میں اپنے بنیادی اور اولین مقاصد کی طرف ایک ایک کر کے پیشقدمی شروع کر دی ہے اس سفر کی اہم منزل تو وہ ہوگی جس میں ندوۃ العلماء پھر ایک بار ان شاء اللہ تعالیٰ تحریکی شکل میں ملک اور عالم اسلام میں ابھرے گا لیکن ان تدریجی مرحلوں میں سے ایک اہم ترین مرحلہ کتب خانۂ ندوۃ العلماء کو علوم اسلامیہ اور علوم جدیدہ کی ایک مثالی لائبریری بنانا ہے۔ آج بھی کتب خانۂ ندوۃ العلماء اپنے علمی ذخیرے اور نادر و نایاب مخطوطات کی وجہ سے ہندوستان کے مشرقی کتب خانوں میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ مگر لائبریری سائنس نے علمی دنیا میں جو ترقی حاصل کر لی ہے اور اس میں جو جدید اور مفید تجربے ہوئے ہیں افسوس ہے کہ ان سے کما حقہ استفادہ کا رجحان ابھی پوری طرح ہمارے دینی مدارس میں پیدا نہیں ہوا۔ مسلمانوں نے علوم کی ہر دور میں سرپرستی اور رہنمائی کی ہے۔ ہر شعبۂ علم میں ان کے انمٹ نقوش ثبت ہیں بلکہ دنیا کو اپنے علمی سفر کے لئے اسی پامال راہ پر چلنے پر مجبور ہونا پڑا جو مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں بنائی تھی۔ اسلامی کتب خانوں اور علمی خزانوں سے پوری دنیا نے استفادہ کیا مگر اس میدان میں بھی ہم دوسروں کے مقلد اور خوشہ چیں بن کر رہ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ لائبریری سائنس کی جدید ترقی میں ہمارا کوئی ممتاز و نمایاں حصہ نہیں ہے۔ ہماری اپنی کوئی ایسی مخصوص لائبریری سائنس نہیں ہے جو ہمارے علوم کی تمام شاخوں دینیہ ادبیہ اور علوم جدیدہ کے تمام شعبوں پر محیط ہو۔

ندوہ نے اپنے کتب خانہ کی تنظیم جدید اور ... (باقی)

آہ! حافظ سید حبیب الرحمٰن حسنی

ایک خاموش اور گمنام مثالی شخصیت

قارئین "تعمیر حیات" کو بخوبی یاد ہوگا کہ چند ماہ پہلے تعمیر حیات میں مشہور شعراء کے کلام کا انتخاب مسلسل کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا جسکو ترتیب دینے والے ہمارے ایک بزرگ حافظ سید حبیب الرحمٰن حسنی تھے اس انتخاب سے حافظ صاحب کے ذوق شعر و سخن اور ادب میں انکی دلچسپی اور انہماک کا پتہ چلتا تھا، ان مضامین سے اہل علم طبقہ میں بڑا فائدہ محسوس کیا گیا تھا افسوس ہے کہ ان مفید مضامین کا سلسلہ آگے نہ چلا اور حافظ صاحب کا انتقال ہوگیا۔ ان کا ہم پر حق ہے کہ ہم انکی زندگی کے مختصر حالات لکھ کر انکا قارئین "تعمیر حیات" سے تعارف کرائیں۔

حافظ صاحب ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۸ نومبر ۱۹۰۴ء کو دائرہ شاہ علم اللہ ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب کا نام حافظ سید عبد الشکر تھا جو خانوادہ شاہ علم اللّٰہی کے مشہور صاحب طریقت بزرگ حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب کے صاحبزادے تھے [illegible] لکھنؤ میں متوسطات تک تعلیم حاصل کی تھی [illegible] ذوق رکھتے تھے ۱۹۲۳ء میں انکا انتقال ہوا [illegible] صاحب نے اولاً اپنے والد ماجد کی آغوش تربیت میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اسکے بعد اپنے خاندان کے ایک بزرگ مولانا سید عزیز الرحمٰن صاحب سے (جو خاندان کے تمام لڑکوں کے استاد تھے اور جن سے خاندان کے سب لوگوں نے پڑھا) اردو و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر لکھنؤ میں انگریزی تعلیم حاصل کی، اسی اثناء میں تحریک ترک موالات کا دور ہوا تو حافظ صاحب میں وطن کی آزادی کا جذبہ پیدا ہوا اور انہوں نے اسکی خاطر انگریزی تعلیم چھوڑ دی اور اس تحریک میں شریک ہوگئے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن کی آواز پر لبیک کی اس کے بعد جامعہ ملیہ میں داخلہ لیا اور بی۔ اے تک وہاں تعلیم حاصل کی یہ وہ دور تھا جبکہ علی برادران نے خلافت کی تحریک چلائی اور پورے ہندوستان میں اس کا غلغلہ بلند ہوا۔ علی برادران کی والدہ بی اماں کے دورے ہونے لگے اس دور سے میں انہوں نے رائے بریلی کا بھی دورہ کیا ان کو خبر ہوئی کہ مولانا سید عبد الحئی ناظم ندوۃ العلماء کا انتقال ہوگیا تو وہ تعزیت کی خاطر دائرہ شاہ علم اللہ بھی آئیں اور مولانا مرحوم کی اہلیہ محترمہ [illegible] صاحبزادے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی [illegible] اس وقت انکی بیعت [illegible] اور [illegible] خاندان کے نوجوان کرسی پر انکو بٹھانے کے لیے [illegible] ایک [illegible] حریت آواز

جب یہ ہری تھی [illegible]

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دیدو

اس ماحول میں حافظ صاحب کی نوجوانی گزری انکے دل و دماغ میں آزادی وطن، تحریک خلافت اور دین و ملت کا درد و جوش پیوست ہوتا رہا اسکے علاوہ حافظ صاحب کے بڑے بھائی مولانا سید ابو الخیر صاحب برقی جو عربی و اردو ادب میں سند کا درجہ رکھتے تھے اور شعر و سخن سے گہرا ذوق رکھتے تھے، مشہور اساتذہ فن شعر و شاعری کی صحبتوں میں بیٹھتے تھے۔ لکھنؤ کے مشہور اساتذہ، ثاقب لکھنوی، صفی لکھنوی کے صحبت یافتہ تھے ان کی وجہ سے حافظ صاحب میں بھی شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوگیا۔ اور وہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے بعض دفعہ اپنا کلام بھی سنایا اور یہ ذوق اتنا بڑھا کہ دائرہ شاہ علم اللہ میں جو ایک دینی مرکز تھا شعر و شاعری کی مجلسیں جمنے لگیں اور ایک مرتبہ جگر مرادآبادی کو (جو اس زمانے میں شباب و شراب کے رنگین دور سے گزر رہے تھے اور ہر طرف انکی جادو بھری آواز اور انکے تغزل کا چرچا تھا) لے آئے اور جگہ جگہ مشاعرے ہوئے۔ ان صحبتوں نے حافظ صاحب میں شعر و سخن کا اچھا خاصا ذوق پیدا کر دیا اور مشہور شعراء کے منتخب اشعار انکے نوک زبان ہوگئے وہ دیوانوں کا سہارا کم لیتے اور پوچھنے پر زبانی اشعار پڑھنے لگتے۔

دوسری طرف دینی اور علمی رنگ کا یہ حال تھا ایام طالب علمی ہی میں قرآن شریف حفظ کرنا شروع کر دیا اور صرف چھ ماہ میں پورا قرآن شریف حفظ کر لیا پھر مسلسل ہر رمضان کو محراب سنانے لگے حفظ کرنے میں اس سے بڑی مدد ملی کہ خاندان میں اسوقت کثرت حافظ تھے۔ انکے والد، انکی والدہ، انکے ماموں اور پھر بھی وہ جگہ گئے تو ہر جگہ قرآن شریف کا چرچا دیکھتے جس سے انکے اندر جوش پیدا ہوتا [illegible] ذوق [illegible] بنا نے قرآن حفظ کر لیا۔ فراغت کے بعد وہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں [illegible] راجستھان گئے پھر [illegible] بعد [illegible] اور دینی تعلیم [illegible] کی حالت [illegible] اور [illegible] انگریزی تعلیم [illegible] اپنے پاس [illegible]

آخر میں خانہ نشین ہوگئے تھے۔ حافظ صاحب کو اپنی جوانی میں کھیل کا بھی شوق تھا، وہ کثرت کرتے، پہلوانوں سے ملتے ان سے داؤ پیچ پوچھتے لڑکوں کو ہر طرح کا کھیل کھلاتے انکی وجہ سے خاندان میں کھیلوں کا رواج ہوگیا شام ہوتی لوگ قسم قسم کے کھیلوں میں مشغول ہوتے۔ آخر عمر میں دین کا رنگ بہت چڑھ گیا تھا ہر وقت دینی کتابوں اور رسالوں کا مطالعہ کرتے رہتے جب بھی کوئی ان سے ملنے جاتا اکثر پڑھتے ہوئے پاتا، انگریزی رسالے اور اردو رسالے سب پڑھتے تھے کمزور ہوتے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ کمزوری اتنی بڑھی کہ صاحب فراش ہوگئے چلنا پھرنا دشوار تھا مگر نماز مسجد میں پڑھتے رہے اور شام کو مولانا ابو الحسن علی ندوی کی مجلس میں اکثر حاضر ہوتے اور کتاب سنتے، مولانا انکے چھوٹے بھائی تھے۔ روز نماز ظہر کے بعد حافظ صاحب مولانا کے پانچ پارے سنتے اور خود بھی دس پارے پڑھتے مگر ادھر اس تلاوت میں ناغہ ہوتی، ہر وقت مطالعہ ہوتا یا قرآن شریف کی تلاوت۔ رمضان المبارک میں ایک قرآن ختم کر لیتے جب ضعف بہت بڑھا تو چند پارے پڑھنا معمول بن گیا تھا اور یہ معمول آخری دن تک جاری رہا۔ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت کا تعلق تھا اسکے علاوہ حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوریؒ، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور حضرت شیخ الحدیث صاحب سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ ان کی مجلسوں میں بیٹھتے، انکی کتابوں کا مطالعہ رکھتے تھے تو ضع، انکساری، سخاوت و فیاضی بہت تھی۔ افسوس ہے کہ حافظ صاحب نے تقریباً ۸ سال ضعف و ناتوانی اور کمزوری کی تکلیف میں گزارے۔ بیشتر صاحب فراش رہتے۔ آخر میں یہ بیماری اتنی بڑھ گئی کہ ذرا بھی حرکت کرنا مشکل ہوگیا تھا آخر کار ۲۹ جون ۱۹۸۲ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ ۷۸ سال کی عمر پائی۔ اپنے آباء و اجداد کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ اپنے پیچھے سوائے تھوڑی سی جائداد کے اور چند علمی و تنقیدی مضامین کے کوئی یادگار نہیں چھوڑی۔ ایک صاحبزادی تھیں جو انکی حیات ہی میں ۱۹۷۶ء کو انتقال کر گئی تھیں، اور اپنی یادگار میں ایک لڑکا ضیاء النبی کو چھوڑا جو حافظ صاحب کا نواسہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بچے کو اپنے جد امجد حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کے نقش قدم پر چلائے اور اس کو اسم بامسمّیٰ بنائے کہ انہی کے نام پر اسکا نام رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حافظ صاحب کی مغفرت فرمائے۔ ہم قارئین تعمیر حیات سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ بھی حافظ صاحب مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کریں

اور

ان کے لئے ایصال ثواب کریں۔

بقیہ اداریہ ص ۳ اہل علم اور اصحاب خیر

نئی عمارت کے تعمیر کے ذریعہ علوم مشرقیہ کے اس عظیم خلاء کو پُر کرنے کا اقدام کیا ہے جو اس وقت پورے عالم اسلام پر چھایا ہوا ہے۔

چونکہ ارباب ندوہ کا یہ اقدام کثیر سرمایہ کا طالب ہے، کتب خانہ کی نئی عمارت کتابوں کی جلد بندی، مخطوطات و نوادر کی حفاظت، مختلف علوم و فنون کی مختلف زبانوں کی کتابوں کی خریداری فرنیچر اور ٹرینڈ اسٹاف، یہ سب وہ ناگزیر ضروریات ہیں جنہیں ندوہ تنہا اپنے وسائل سے پورا نہیں کر سکتا۔

لہٰذا ہم اس اہم اور ضروری مقصد کے لئے ہر شخص سے درخواست اور ہر دروازے پر دستک دینے کے لئے اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔

کتب خانہ ندوۃ العلماء کی تنظیم جدید کا کام الحمد للہ سال گذشتہ سے جاری ہے۔ نئی عمارت کی تعمیر اور اس کام کی تکمیل کے لئے مجموعی مصارف کا تخمینہ [illegible] لاکھ روپے ہے، ہم اس مد میں ہر قسم کی غیر مشروط اعانت کی درخواست کرتے ہیں افراد سے بھی اور اداروں سے بھی ہم ملک کے اہل علم اور دانشوروں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس اسکیم کی بھرپور تائید و تعاون کے مستحق [illegible] امید ہے کہ علمی دنیا اور ندوہ کے اس مخلصانہ قدم کے لئے ہر گوشہ سے تائید و تعاون اور ہر فرد کا [illegible] ہے قدم بقدم تعاون حاصل ہوگا۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا سفر کشمیر

[illegible] مولانا سید ابو الحسن علی ندوی [illegible] کشمیر تشریف لے جا رہے ہیں [illegible] حضرت مولانا [illegible] صاحب [illegible] مولانا [illegible] ہونگے۔

بارگاہِ خلفائے راشدینؓ میں اُردو شعراء کا نذرانۂ عقیدت

(۱) امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ

منظر صدیقی

ہزاروں یوں تو پروانے تھے دربارِ رسالتؐ کے
ادا سب نے کئے جتنے فرائض تھے رفاقت کے
مگر اک جاں نثارِ باوفا، جو یا حقیقت کا
ستونِ اوّلیں کہتے ہیں جس کو سب خلافت کا
رفیقوں میں نبیؐ کے اس کا رتبہ سب سے بالا تھا
رضائے حق میں سر اپنا جھکانا جس کو آتا تھا
ہوئی عشقِ رسول اللہؐ کی کچھ ایسی سرشاری
نہ تھا پیشِ نظر کچھ بھی مگر فکرِ وفاداری
شفیق ایسا کہ اہلِ بیتؓ کا غمخوار کہلایا
رفیق ایسا کہ دنیا بھر میں "یارِ غار" کہلایا
نثارِ ملّت بیضا کیا سب مال و زر اپنا
مدارِ زندگی رکھا رسول اللہؐ پر اپنا
درخشاں ہے صداقت اس طرح صدیق اکبرؓ کی
کہ جیسے چاند تاروں میں ضیاء ماہِ منوّر کی

(۲) امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ

مظہر القادری

تیرے در پر جبۂ سا روم و مدائن کا شکوہ
تیری ٹھوکر پر پڑا تھا قیصر و کسریٰ کا تاج
اللہ اللہ تو نے ٹوٹے بورئے پر بیٹھ کر
سرکشوں سے نذر لی اور بادشاہوں سے خراج
کفر و بدعت کی ترے آنے سے نبضیں چھٹ گئیں
تیری دانائی نے پہچانا زمانے کا مزاج
تیری سطوت کا یہ عالم ہے کہ تیرے نام سے
کفر کے دل میں ہوا کرتا ہے اب بھی اختلاج
اٹھ کہ پھر انصاف کی گردن تہہ شمشیر ہے
اٹھ کہ پھر سارے زمانے کو ہے تیری احتیاج

(۳) امیر المومنین حضرت عثمانؓ

انجم صدیقی اکبرآبادی

وہ جاں نثارِ محمدؐ و قاریِ دینِ مبیں
عرب کا مردِ غنی مومنوں کا روحِ رواں
حیا پہ حور و ملائک فریفتہ جس کی
حجابِ قدس کا وہ ایک نیرِ تاباں
وہ ذاتِ خاص ہے جس کا خطاب ذوالنورینؓ
وہ جسکو مل گئی دونوں جہاں کی عظمت شان
وہ روحِ مرکزِ اسرار کانِ کشف و کمال
وہ جس کو خود کرے سیراب قلزمِ عرفاں
سزائے رشک ہے اسکی بلند تقدیری
خدا نے جس کو بنایا ہے جامع القرآں
وجود جود و سخاوت اسی کے دم تک تھا
کہ دیں پہ کر دیا مال و متاع سب قرباں
سکندری بھی ہے بیکار قیصری بھی فضول
بنا سکے تو بنا خود کو پیروِ عثمانؓ

(۴) امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰؓ

میکش اکبرآبادی

علیؓ جلالِ خدا ہے علیؓ کمالِ خودی
علیؓ جمالِ نبیؐ ہے نہ ہے جمالِ نبیؐ
علیؓ وہ بندۂ مولا صفت ہے کیا کہئے
کہ گرچہ نفسِ نبیؐ ہے مگر نہیں ہے نبیؐ
علیؓ وہ شیرِ الٰہی ملوکیت دشمن
جلا نہ عہد میں جس کے چراغِ بادشہی
علیؓ کا فقر ہے تیغ جہاد و فکر و عمل
[illegible] فقر نہیں بادِ ہوئے خانقہی
علیؓ کا علم ہے جذبِ سرور و وجد و حضور
علیؓ کا علم نہیں بحثِ شیعی و حنفی

قادیانیت — اسلام اور نبوت محمدی کیخلاف ایک بغاوت

[illegible] مقالہ [illegible] میں [illegible] تھی جو قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے [illegible] اس تحریک کو دبانے کے [illegible] آج [illegible] پاکستان میں پیدا ہو گیا ہے [illegible] کو سمجھنے کیلئے اس مقالہ کے مطالعہ سے بڑی مدد ملے گی۔

میں اس مقالہ میں ایک ایسے مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں جو ہر مسلمان کی توجہ کا مستحق ہے خواہ وہ کسی ملک میں رہتا ہو [illegible] اس کا تعلق اسلام کے بعض بنیادی اصولوں سے ہے — اگر مسلمانوں نے اس سے غفلت برتی تو ان کا قومی وجود خطرے میں [illegible] انہیں [illegible] اختیار کرنے [illegible] اسلامی اور پاکستان [illegible] کے [illegible] مٹ جانے اور [illegible]

پاکستان [illegible] حال ہی میں [illegible] کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور [illegible] حکومت کے سامنے [illegible] مسئلہ [illegible] قادیانیت کی طرف [illegible] مسلمان [illegible] اور [illegible] لیکن [illegible]

پاکستان کے اسلامی ذہن کا اس طرف متوجہ ہونا بالکل بجا ہے کیونکہ مسلمانوں کی ہستی اور پاکستان کی [illegible] ریاست کے مستقبل کے لئے یہ ایک پریشان کن مسئلہ ہے [illegible] اس حقیقت سے [illegible] مسلمانوں [illegible] اسلامی [illegible] کا [illegible] سے [illegible] لوگوں کا گمان ہے [illegible] اسلامی [illegible] اور مسلمانوں [illegible] کا [illegible] ہے [illegible] روشنی میں دیکھیں۔

علمی اور تاریخی حیثیت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ قادیانیت فرنگی سیاست کے بطن سے وجود میں آئی ہے۔ صورت یہ ہے کہ [illegible] ہندوستان کے مشہور و معروف مجاہد حضرت سید احمد شہید [illegible] نے [illegible] مسلمانوں میں جہاد اور قربانی کی آگ [illegible] اسلامی شجاعت اور [illegible] مجاہدوں کی تعداد [illegible] اس تحریک [illegible] جمع ہو گئے [illegible] انگریز [illegible] برطانوی حکومت کے لئے [illegible] اور [illegible] کا سبب [illegible] جہاد اور [illegible] کا [illegible] اسلام [illegible] جہاد [illegible] مسلمانوں [illegible] اور اس کو [illegible]

مزاج میں [illegible] کرنے کے لئے دین کے سوا کوئی ذریعہ نہیں [illegible] برطانوی حکومت نے یہ طے کیا کہ مسلمانوں ہی میں سے کسی شخص کو [illegible] دینی منصب کے نام سے ابھارا جائے کہ مسلمان عقیدت کے ساتھ اس کے گرد جمع ہو جائیں اور وہ انگریزی حکومت کی وفاداری اور خیر خواہی کا ایسا سبق پڑھائے کہ پھر انگریزوں کو مسلمانوں سے کوئی خطرہ نہ رہے۔ یہ حربہ تھا جو برطانوی حکومت نے اختیار کیا کیونکہ مسلمانوں کا مزاج بدلنے کے لئے کوئی حربہ اس سے زیادہ کارگر نہیں ہو سکتا تھا — مرزا غلام احمد قادیانی — جو ذہنی انتشار [illegible] سے اپنے دل میں یہ خواہش رکھتا تھا کہ وہ ایک [illegible] کے [illegible] مذہبی پیشوا اور تاریخ میں اس کا [illegible] نام اور مقام ہو جیسا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ انگریزوں کو اس کام کے لئے موزوں شخص نظر آیا [illegible] اس کی شخصیت [illegible] انگریزی اغراض کے لئے مسلمانوں میں کام کرے۔ چنانچہ اس نے بڑی تیزی سے کام شروع کیا۔

پہلے منصب تجدید کا دعویٰ کیا پھر ترقی کر کے امام مہدی بن گئے اور پھر آگے بڑھ کر مسیح موعود ہونے کی بشارت ہو گئی اور آخر کار نبوت کا دعویٰ کیا اور انگریز نے جو چاہا تھا وہ پیدا ہو گیا۔ اس قادیانی نے اپنا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا اور انگریز نے بھی اس کی سرپرستی میں کوئی کمی نہیں کی۔ [illegible] ہر طرح کی سہولتیں اس کے کام [illegible] قادیانی نے بھی گورنمنٹ کے ان احسانات کو فراموش نہیں کیا اور ہمیشہ اس بات کا معترف رہا کہ اس کا وجود برطانیہ عظمیٰ کا رہین منت ہے۔ چنانچہ اپنی ایک تحریر میں خود کو حکومت برطانیہ کا "خود کاشتہ پودا" قرار دیتا ہے اور ایک جگہ اپنی وفاداریوں اور خدمت گزاریوں کو گنانے ہوئے لکھتا ہے:۔

"میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید و حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کئے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے ایسی کتابوں کو تمام ممالک عرب اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے۔" (تریاق القلوب از مرزا قادیانی ص ۱۵)

ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو تقریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں اپنی زبان اور قلم سے اس اہم کام میں مشغول ہوں کہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دور کروں جو ان کو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔" (تبلیغ رسالت [illegible])

[illegible] کتاب [illegible] لکھتا ہے [illegible]

ولیسے مسئلہ جہاد کے متعلق بہت سے جاہلے کیا [illegible] لیکن میں مسئلہ جہاد کا انکار کرتا ہے۔ (ست)

ایک اور جگہ کہتا ہے کہ:۔

"میں نے بیسیوں کتابیں عربی اور فارسی اور اردو میں اس غرض سے تالیف کی ہیں کہ اس گورنمنٹ محسنہ سے ہرگز جہاد درست نہیں بلکہ سچے دل سے اطاعت کرنا ہر ایک مسلمان کا فرض ہے چنانچہ میں نے یہ کتابیں بصرف زر کثیر چھاپ کر بلاد اسلامیہ میں پہنچائی ہیں اور میں جانتا ہوں کہ ان کتابوں کا بہت سا اثر اس ملک (ہندوستان) پر بھی پڑا ہے اور جو لوگ میرے ساتھ مریدی کا تعلق رکھتے ہیں وہ ایک ایسی جماعت تیار ہوتی جاتی ہے کہ جن کے دل اس گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی سے لبالب ہیں ان کی اخلاقی حالت اعلیٰ درجہ پر ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ وہ تمام اس ملک کے لئے بڑی برکت ہیں اور گورنمنٹ کے لئے دلی جاں نثار ہیں۔"

(عریضہ بجناب حضرت ملکہ معظمہ قیصرہ ہند از مرزا غلام احمد)

مرزا غلام احمد کی اس تحریک اور اس کی اس جماعت نے انگریزی حکومت کے لئے بہترین جاسوس اور مخبر پیدا کئے [illegible] دوست اور جاں نثار بن گئے [illegible] اس گروہ کے بعض چیدہ اشخاص نے [illegible] حکومت کی بڑی خدمات کیں اور اس سلسلہ میں جانی قربانی تک سے دریغ نہیں کیا جیسے عبداللطیف قادیانی جو افغانستان میں قادیانی مذہب کی تبلیغ اور جہاد کی مخالفت کرتا تھا اس کو حکومت افغانستان [illegible] کیونکہ اس کی دعوت سے اس بات کا خطرہ تھا کہ افغان قوم کا وہ جذبۂ جہاد اور حوصلہ سرد نہ پڑ جائے جس کے لئے وہ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اسی طرح ملا عبدالحلیم قادیانی اور ملا نور علی قادیانی بھی انگریزی حکومت کے لئے افغانستان میں خفیہ کام کرتے تھے اور [illegible] ان کے قبضہ سے حکومت افغانستان کو کچھ ایسے خطوط اور کاغذات ملے جن سے [illegible] تھا کہ یہ دونوں برطانوی حکومت کے ایجنٹ ہیں اور حکومت [illegible] کے خلاف سازش میں مشغول ہیں جیسا کہ افغانستان کے وزیر داخلہ کے ۱۹۲۵ء کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے اور قادیانیوں کے سرکاری اخبار "الفضل" نے اپنی ۳ مارچ ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں اس بیان کو نقل کیا اور اس قربانی پر بہت ہی خوشی کا اظہار کیا۔

عملی ہذا یہ قادیانی جماعت اپنے دور اول سے اب تک [illegible] تمام وطنی تحریکات سے کنارہ کش رہی، ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں نہ مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی میں اور نہ اس کے بعد اور صرف یہی نہیں بلکہ انگریزوں ہی کی طرح قادیانیوں کی توجہ (مستشرقین) کے اصول عام [illegible] رہے تھے وہ ان کے لئے موجب فخر نہیں باعث [illegible] تھی عام زندگی سے اسلامی مسائل سے یا ان اسلامی [illegible] جو اسلامی حمیت یا سیاسی شعور کا نتیجہ تھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ کام ہمیشہ مذہبی مباحثہ اور موشگافیاں تھیں اور ان کی [illegible] صرف وفات مسیح، حیات مسیح، نزول مسیح اور نبوت پر مباحثوں اور مناظروں تک محدود رہا۔

ہندوستان کے علماء اسلام اور ارباب فکر [illegible] فتنہ کو بہت تشویش کی نگاہ سے دیکھا اور اپنے زبان و قلم کے ہتھیاروں سے اس فتنہ کی جڑ کاٹنے کی پوری پوری کوشش کی اور [illegible] کیونکہ اس کی سیاسی اقتدار کے دور میں [illegible] اور سرپرست موجود [illegible] مگر [illegible] اسلام [illegible] حکومت کے [illegible] قادیانی [illegible]

مولانا انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند (رحمہ اللہ تعالیٰ)۔
اور دوسرے علماء اور دانشوروں میں، سب سے جوش اور سرگرمی سے اس باغی گروہ
کے خلاف جنگ کرنے والی جماعت مجلس احرار اسلام رہی جس کے قائد
اور روحِ رواں سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ اور [illegible]
اعلان کیا تھا ان مفکر کی [illegible] محمد اقبال بھی ہیں۔
جنہوں نے اپنی بعض تصانیف میں بہت صاف صاف کہا
کہ قادیانیت نبوت محمدی کے خلاف ایک بغاوت ہے!
اسلام کے خلاف ایک سازش ہے! یہ ایک مستقل دین
ہے! اس کے ماننے والے ایک الگ امت ہیں اور یہ امت
مسلمہ کا جزو نہیں ہے! اور یہ ظاہر
ہے کہ اقبال کوئی مولوی اور صوفی نہ تھے۔ ان کا شمار
دنیائے اسلام کے منتخب تعلیم یافتہ اور روشن خیال
افراد میں تھا اور اتحاد اسلامی کے ان اول درجہ کے
داعیوں میں سے تھے جن کی دعوت کا اولین اصول بے
تعصبی اور رواداری ہے۔ لیکن چونکہ وہ مرزا غلام احمد
کو قریب سے جانتے تھے اور ان کے مذہب اور اس کے
مقاصد و اسرار سے گہری واقفیت رکھتے تھے اس لئے
وہ بھی اس فتنہ کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے پر مجبور
ہوئے اور وہ پہلے شخص تھے جس نے قادیانیوں کو
مسلمانوں سے الگ کر کے ایک غیر مسلم اقلیت قرار
دینے کا خیال پیش کیا۔

یہاں ہم ان کے مقالات اور خطبات کے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں۔
علامہ مرحوم نے ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار اسٹیٹسمین کو
جس نے ایک بار اس مسئلہ کو اٹھایا تھا ـــ لکھ کر [illegible]
"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متوازی ایک علیحدہ نبوت پر ایک
نئے گروہ کی بنیاد رکھنے کی منظم کوشش کا نام ہے۔" اور اسی زمانہ
میں جب ہندوستان کے موجودہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ
سوال کیا کہ مسلمان قادیانیوں کو اسلام سے جدا کرنے پر کیوں اصرار
کرتے ہیں جب کہ قادیانی بھی مسلمانوں کے بہت سے فرقوں کی طرح اسی
کا ایک فرقہ ہیں؟ تو علامہ مرحوم نے ان کو جواب دیتے ہوئے کہا
کہ ہم اس بات پر اس لئے مصر ہیں کہ قادیانی تحریک نبی عربی صلی اللہ
علیہ وسلم کی امت میں سے ہندی نبی کی امت کو تراشنے کی کوشش
کر رہی ہے۔ اور کہا کہ "ہندوستان میں اسلام کی حیات اجتماعیہ
کے لئے یہ تحریک اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہے جتنی یہودی قوم کی
حیات کے لئے یہود کے ایک باغی فلسفی اسپینوزا [illegible]
کے عقائد ہو سکتے تھے۔"

اقبال نے عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت کے لئے [illegible]
مرحوم کا سینہ کھول دیا تھا اور وہ اس حقیقت سے [illegible]
کہ یہ عقیدہ ہی اسلام کی حیات اجتماعی اور وحدت کی [illegible]
کا محافظ ہے اور اسی عقیدہ سے بغاوت [illegible]
کا مستحق نہیں ہے [illegible] ملت اسلامیہ کی بنیاد [illegible]
کے مرادف ہے۔ اقبال [illegible]
[illegible] لکھتے ہیں کہ:
"یہ عقیدہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں [illegible]
وہ [illegible] ہے جو اسلام اور ان ادیان کے درمیان ایک مکمل سرحدی
[illegible] کھینچتا ہے۔ جو توحید
پر مسلمانوں کی طرح عقیدہ رکھتے ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بھی
تسلیم کرتے ہیں لیکن وحی و نبوت کا سلسلہ ختم ہونے کے قائل نہیں
ہیں جیسے کہ ہندوستان میں برہمو سماج اور یہی وہ چیز ہے جسے دیکھ کر
کسی گروہ پر داخل اسلام یا خارج اسلام ہونے کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔
میں تاریخ میں کسی ایسے مسلمان گروہ کا نام نہیں جانتا جس نے اس
خط کو پھاند جانے کی جرأت کی ہو۔ ایران کے فرقہ بہائیہ نے ضرور
عقیدۂ ختم نبوت کا انکار کیا لیکن انہوں نے صاف صاف یہ بھی
اعلان کیا کہ وہ ایک الگ جماعت ہیں جو عرف عام کے اعتبار سے
مسلمان نہیں۔"

"بے شک ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا
ہوا دین ہے لیکن اس کا قیام بحیثیت ایک سوسائٹی یا بحیثیت ایک امت
سراسر حضرت محمد کی شخصیت پر موقوف ہے۔ اس لئے قادیانیوں کے
سامنے صرف دو ہی راستے ہیں یا تو وہ بہائیوں کی تقلید کریں اور خود
کو مسلمانوں سے جدا کر لیں یا ختم نبوت کی تاویل کی تفسیر [illegible]
ورنہ ان کی یہ سیاسی ڈھب کی تاویلات ان کے دل کے اس چور کی غمازی
کر رہی ہیں کہ یہ لوگ صرف ان فوائد کے لالچ میں مسلمانوں کے حلقہ
میں گھسے رہنا چاہتے ہیں جو قوانین مسلمانوں کے نام سے وابستہ ہیں کیونکہ
ان کے بغیر ان فوائد و منافع میں انہیں کوئی حصہ نہیں مل سکتا۔"

موصوف ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ:
"ہر وہ گروہ جو [illegible] اصطلاحی اسلام سے انحراف کرے اور
اس کا دعویٰ ہو کہ وہ کسی ایک نئی نبوت کی بنیاد پر استوار ہے اور وہ
ان تمام مسلمانوں کو صاف صاف کافر کہتا ہو جو اس نئی خانہ ساز
نبوت کی تصدیق نہ کریں وہ گروہ اسلام کی سالمیت کے لئے ایک بڑا
خطرہ ہے اور مسلمانوں کو اس پر سختی سے نظر رکھنی چاہئے اسلامی
معاشرہ کی وحدت صرف عقیدۂ ختم نبوت پر منحصر ہے۔"

یہ تھا اقبال جیسے روشن خیال فاضل کا رویہ قادیانیت کے
بارے میں لیکن وقت گزرتا رہا، قادیانی اپنے کاموں میں مشغول رہے،
فتنے اٹھاتے رہے، مناظرے کرتے رہے، شکوک و شبہات پھیلاتے
رہے، انگریزی سیاست کی خدمت کرتے رہے۔ ان کا مرکز ضلع گورداس
پور (پنجاب) کا ایک قصبہ قادیان تھا، انگریز کے سایۂ عاطفت میں یہ
شر انگیزیاں کر رہے تھے۔ لیکن یہ بات کبھی ان کے خواب و خیال
میں بھی نہ آئی تھی کہ کسی وقت کوئی بڑی سیاسی قوت بھی ان کے قبضہ
میں آ جائے گی اور [illegible] کوئی ایسی نئی بنائی مملکت ہاتھ آ جائے گی
جس میں ان کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگا۔ کیونکہ اول تو انہوں نے ملک کی
سیاسی جد و جہد اور جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اور دوسرے
یہ کہ ان کی تعداد بہت تھوڑی اور مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت سے بنی
ہوئی تھی۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں یکایک مملکت پاکستان کی داغ بیل پڑ گئی
اور یہ چیز جس کا تصور بھی قادیانی اپنے حالات کے پیش نظر نہیں کر سکتے
تھے بغیر ایک قطرہ خون گرائے ہوئے انہیں مل گئی ـــ یعنی حکومت
اور طاقت ـــ یہ کیسے ہوا؟ اس کی تفصیل بڑی عجیب ہے۔

ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور پاکستان بن گیا۔ برطانوی
حکومت بوریا بستر لے کر ہندوستان سے چلی پڑی، مگر چلتے وقت
سر ظفر اللہ خاں کو پاکستان میں متعین کر گئی۔ یہ صاحب اپنی انگریز دوستی
میں مشہور بلکہ انگریزوں کے ساختہ و پرداختہ تھے، اور انگریز حکمران
جانتے تھے کہ تنہا یہی شخص ہے جو اس سرزمین پر انگریز کے مفاد کا
محافظ ہوگا اور اس ملک کو برطانیہ کا [illegible] بنا کر رکھے گا۔
اسی غرض کے لئے محمد علی جناح مرحوم کو [illegible]
کے قول کے مطابق ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ سر ظفر اللہ خاں کو پاکستان
کا [illegible]
[illegible]

اہمیت رکھتا تھا اس کے زیر اثر آنے کے بعد ممکن تھا کہ مشرق وسطیٰ پر
اس سارے خطے کی سیاست مسلط ہو [illegible] کیونکہ پاکستان دنیا کی سب سے
بڑی اسلامی حکومت ہے اور مشرق وسطیٰ کے مسلمان ملکوں پر اس کا اثر
پڑنا ناگزیر ہے۔ بہرحال اس نئی مملکت کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں
ہوئے جن کا ایمان یہ ہے کہ اس ملک کی غالب اکثریت کافر ہے کیونکہ
وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کو نہیں مانتی۔ ظفر اللہ خاں کا ایسا
سمجھنا ان کے دین و عقیدہ کے عین مطابق ہے کیونکہ مرزا غلام احمد
کے صاحبزادے نے تصریح کی ہے کہ جو مسلمان اس نئے دین پر ایمان نہیں
رکھتے وہ کافر ہیں۔ ان کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ ان کو لڑکی دینا جائز
نہیں الغرض ان کے ساتھ کفار کا سا معاملہ کرنا چاہئے۔ مرزا بشیر الدین
ابن غلام احمد جو موجودہ خلیفہ ہیں اپنی کتاب "آئینۂ صداقت" میں لکھتے ہیں:
"کل مسلمان جو حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے
خواہ انہوں نے حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر اور دائرہ
اسلام سے خارج ہیں۔" (ص ۳۵)

اور یہی خلیفہ صاحب ایک عدالت کے سامنے اپنا بیان دیتے ہوئے کہتے ہیں:
"ہم چونکہ مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں اور غیر احمدی آپ کو نبی نہیں
مانتے اس لئے قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق کہ کسی ایک نبی کا انکار بھی
کفر ہے، غیر احمدی کافر ہیں۔"
(بیان مندرجہ اخبار الفضل [illegible])

ایک تقریر میں اپنے اور مسلمانوں کے اختلافات کے سلسلہ میں
مرزا صاحب کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ:
"اللہ تعالیٰ کی ذات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن، نماز،
روزہ، حج، زکوٰۃ۔ غرض ایک ایک چیز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے۔"
(الفضل [illegible])

اور مشہور ہے کہ پاکستان کے قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کا
انتقال ہوا تو چونکہ عقیدہ کی بنا پر سر ظفر اللہ خاں نے آپ کی نماز جنازہ
نہیں پڑھی ـــ

سر ظفر اللہ خاں نے پورے عزم اور [illegible] کے ساتھ
اثر و اقتدار سے فائدہ اٹھا کر وزارت خارجہ اور سفارت کی تمام
کو قادیانیوں سے پاٹ دیا۔ ملکی اور دوسرے سرکاری محکموں میں بھی
گھسایا اور مسلم ملازمین [illegible] قادیانی افسروں کو مسلط
کر دیا جن کی جو [illegible] آتا ہے ان پر حکم چلاتے ہیں۔ عہدے کے
ناجائز دباؤ سے ان میں قادیانیت پھیلاتے ہیں اور جو نہیں مانتے وہ طرح
طرح کی زیادتیوں اور بد سلوکی کا نشانہ بنتا ہے۔

دوسری اس سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ قادیانی
بڑی تعداد میں پاکستانی فوج میں گھس گئے۔ فوج، پولیس اور
سروس کے بڑے بڑے عہدوں پر چھا گئے۔ اور ان محکموں میں
[illegible] کی مصلحت کا تقاضا ہو [illegible]
بغاوت کر سکتے ہیں اور جب چاہیں نظام حکومت اپنے ہاتھوں میں
لے لیں ـــ مزید برآں انہوں نے پنجاب کے نام سے [illegible]
ایک آزاد ریاست [illegible] حکومت سے [illegible]
[illegible] ہے جہاں قانوناً نہیں لیکن عملاً [illegible]
[illegible] کو ہرگز نہیں دی جاتی حتی کہ ربوہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] اور ان کی [illegible] ہیں۔

[illegible]

تعلیمی اداروں میں انتشار و اضطراب کے اسباب اور ان کا علاج

تحریر: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ——— ترجمہ: نور عظیم ندوی

(مدینہ یونیورسٹی کی ایڈمنسٹریٹو کونسل کی میٹنگ میں پیش کردہ مقالہ کی دوسری اور آخری قسط)

انتشار کا شکار اور تضادات سے دوچار اس صورت حال کی اصلاح میرے خیال میں مندرجہ ذیل صورتوں سے ممکن ہے :-

۱۔ نوجوانوں اور طلبہ کے دلوں میں ایمان کو راسخ و مستحکم اور اجر آخرت کے شوق کو بیدار کیا جائے علم اور علماء کے فضائل و مناقب کی طرف توجہ اور دلچسپی بڑھائی جائے، اخلاص کے جذبہ کو فروغ دیا جائے، اللہ کی رضا اور دین کی خدمت کے علاوہ کسی اور مقصد یا محض دنیاوی اغراض کے لئے تحصیل علم کی برائیاں اور اس سلسلہ میں وارد سخت وعیدیں ذہن نشین کرائی جائیں۔

یہ بات تو کھلا ہوا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی غالب اکثریت اغلاط علمی نظر یا فساد ذہن یا گمراہی یا الحاد کا شکار نہیں ہے بلکہ ان کی اصل بیماری یہ ہے سنجیدہ کوشش اور کامل انہماک کی کمی، تعلیم کے اصل اہداف و مقاصد سے غفلت۔ طلبہ کی بہت بڑی تعداد میں ایسا طبقہ ہے جنہوں نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا کہ وہ پڑھ کیوں رہے ہیں؟ انہوں نے بغیر سوچے سمجھے اور بغیر کوئی نشانہ یا مقصد متعین کئے اپنا کام شروع کر دیا۔

اسی کے ساتھ علم اور علماء کے فضائل سے متعلق آیات و احادیث کی طرف دلانا، دعوتی تقریروں، گفتگوؤں اور مذاکرات وغیرہ کے ذریعہ مختلف مواقع پر ان کی طرف رہنمائی سے مدد لیا جا سکتا ہے۔ تعلیم و تربیت اور نفسیات کے ماہرین کا اعتراف ہے کہ انسانی نفوس پر سب سے مضبوط گرفت قوائد اور فضائل پر یقین و اعتماد کی ہوا کرتی ہے۔ یہی یقین تھا جس نے صحابہ کرامؓ اور ان کے متبعین کو رضائے الٰہی کی راہ میں جام شہادت نوش کرنے، اور اسلام کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کا جذبہ پیدا کیا اور اسی یقین و اعتماد کی وجہ سے ان کے سامنے زندگی اور زندگی کی آسائشیں نفس اور بدن کے سارے مطالبات حقیر و بے حقیقت ہو گئے۔

۲۔ تعلیمی اداروں کے مسائل و مشکلات روز افزوں ہیں، جن سے نئی نئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے تعلیم و تربیت مشکل ہے وہ حرج ہوتے ہوئے بھی سنجیدہ کوشش کے ساتھ یہ کہ ایک طرف سے روکا جائے اور دوسری طرف سے جذبہ لگتا ہے یا جس جذبہ کا غلط استعمال ہو۔ طرف ہی اس کی حفاظت کی جائے اور جذبوں کو منظم کیا جائے تو دوسری جانب سے وہ مستحکم ہو جاتے ہیں۔ ان بیشمار الجھنوں اور پیچیدگیوں کا ایک ہی حل اور سب کی شافی علیہ ہے ایسے اساتذہ کا وجود، جنکو اللہ نے ذاتی قوت و صلاحیت، ایمان و علم میں رسوخ، عقل سلیم، حساس دل اور طاقتور جذبہ سے نوازا ہو۔ یہ جادو کی چھڑی ہیں کہ جس کو لگ جائے بدل کے رکھ دے یا پارس کہ جس مٹی سے مس ہو جائے کندن بنا دے ایسی شخصیتیں آج بڑی دولت اور مستقل بیش قیمت انگیز طاقت ہیں کہ ان پر اہم مشکلات اور سخت بحرانوں میں بھی اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ کے سامنے کوئی ایسا پیغام یا ایسی طاقتور اور مثبت دعوت ہو جو نوجوانوں کے دل سے لگ جائے ان کے ذہن و دماغ کو مشغول رکھے ان کے احساس و شعور پر چھا جائے، ان کی عملی صلاحیتوں کو متحرک رکھے اور ان کی حرکت و عمل اور وجد و جہاد و فطرت کو غذا فراہم کرے۔ کسی دوسری دعوت و تحریک کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دے طلبہ اور نوجوان اس کی عظمت و اہمیت پر کامل یقین رکھتے ہوں اور اس کو وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہوں۔

ایسی کسی دعوت کی تلاش و جستجو کی ضرورت نہیں یہ موجود بھی ہے اور جانی پہچانی بھی۔ اسی دعوت کی اساس پر تمام اصلاحی اداروں، اور خاص طور سے وحی الٰہی کے مرکز، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دار الہجرت اور دعوت اسلامی اصل تحریک و تبلیغ میں قائم ہونے والی اس یونیورسٹی کی بنیاد و استوار ہوتی ہیں۔ یہ اللہ کی طرف دعوت ہے دین خالص اور شرک اور اس کے شائبہ سے پاک خالص توحید کی دعوت ہے۔ اسلامی اخلاق و فضائل سے مزین ہونے اور اپنانے کی — دعوت، مغربی جاہلیت کے دنگ — دعوت ہے جس کے بعد شہادت اور اسلامی علوم و معارف کی خامیاں کے باوجود بچے تک کوٹ گئی ہے۔ اور انسانوں کو دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعت میں لانے کی دعوت ہے۔

اس دعوت میں حرکت و قوت اور نمو پیدا کرنے اور اس کو فروغ دینے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بزرگان دین اور مصلحین و مجددین کی زندگی اور ان کی کوششوں اور کارناموں اور عہد جدید دعوت اسلامی کی تاریخ کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ مناسب ہوگا کہ اس کی عملی تربیت کے لئے دعوتی دوروں کا پروگرام بنایا جائے، تربیتی کیمپ لگائے جائیں اور محاضرات کا انتظام کیا جائے۔

۴۔ دار الاقامہ کا اجتماعی نظام رائج کیا جائے جس میں طلبہ اور نوجوان اسلامی تعلیمات کے مطابق ایسے اساتذہ اور نگرانوں کی زیر نگرانی اجتماعی زندگی کے عادی بنیں جو اخلاق میں سیرت و کردار میں علم اور عبادت کے ذوق میں طلبہ کے لئے مثالی اور نمونہ ہوں، وہ صرف طلب سے متاثر نہ ہوں بلکہ توجہ الی اللہ، احتساب نفس، سادہ زندگی، نفسانی خواہشات اور شیطانی مکائد سے احتراز و اجتناب میں عام علماء و اساتذہ سے بھی بلند ہوں، نوجوان ان کی ایمانی حرارت اور قلب کی طاقت کو محسوس کرسکیں اور صرف قانونی طور سے نہیں بلکہ محبت و احترام کے جذبہ سے ان کی اطاعت و اقتدا کریں اور ان کو اپنے لئے اسوہ اور نمونہ بنا لیں۔

۵۔ محاضرات کا ایک جامع پروگرام ترتیب دیا جائے اس کے لئے ممتاز علماء اور مفکرین کو دعوت دی جائے اور ان کے ذریعہ طاقتور عقیدہ کو نوجوانوں کے دلوں میں ان کے رگ و ریشہ میں پیوست کر دیا جائے، ایمان کی چنگاری کو علم کا دی جائے اور اسلام پر یقین و اعتماد کو مزید مضبوط و مستحکم بنا دیا جائے۔ ان محاضرات میں عام ذہنی اور خاص طور سے نوجوانوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالات اور ان چیلنجوں کو موضوع بحث بنایا جائے جن سے طلبہ کو جامعہ اسلامیہ سے نکلنے اور اپنے ممالک کو لوٹنے ہی سامنا کرنا ہوگا، نوجوانوں کی الجھنیں دور ہوں اس حکمت و دانائی اور نرمی کے ساتھ کھولی جائیں کہ وہ یہ نہ محسوس کریں کہ کسی جاہل جاہلی کی منزل سے گذر رہے ہیں، یا مریضوں کی طرح ان کا علاج کیا جا رہا ہے یا ڈوبنے والوں کی طرح ان کو بچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

جامعات اور تعلیمی اداروں کا دائرہ کتنا ہی وسیع ہو جائے اور ترقی کتنی ہی بڑھ جائیں ان کو مدارس کی حیثیت حاصل رہے گی وہ اپنے طلبہ کو اخیر کی تاریخ، تجربہ کی دنیا اور مزید معلومات کی کوئی تربیت نہیں دے سکتیں لیکن مزید کے لئے کہ ان کی فکر و نظر اور ان کا تجزیہ کرنے اور ان کی معلومات کے دائرہ کو وسیع کرنے کے لئے محاضرات پر اعتماد کیا جائے اور اس کے لئے بیرونی ممتاز علماء و ماہرین کا انتخاب کیا جائے۔

میرے خیال میں یہی وہ راستے ہیں جن سے ہم ان اسلامی یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کو لاحق انتشار بے چینی اور قوانین و ضوابط کی خلاف ورزی جیسے بہت سے امراض کا ازالہ کر سکتے ہیں۔ اور ان اداروں نے جو فاضل اساتذہ، کتابوں کا وافر ذخیرہ اور راحت و آرام کے اسباب مہیا کئے ہیں طلبہ ان سے صحیح معنوں میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور تعلیم کی غرض پوری کو پورا کر سکتے ہیں۔

یہ وہ امور ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے بہت سے مخصوص بندوں اور خواص کی تربیت کرنے والوں کی رہنمائی فرمائی اور انہوں نے اپنے حدود عمل میں ان کا تجربہ کیا اور کامیاب رہے۔

مجھے یقین ہے کہ ایمان و محبت سے معمور دعوت اور پیغام سے آباد، صبر و تحقق، بلند نگاہی اور عالی ہمتی پیدا کرنے میں معاون اور سکینت سے فیضیاب یہ تدبیریں، بالخصوص کہ جامعہ اسلامیہ مسجد نبوی کی گود اور اسلامی آثار اور نورانی یادوں کے زیر سایہ نشاط و عمل کی منازل طے کر رہی ہے، مذکورہ بالا مقاصد کے حصول میں مفید و مددگار ثابت ہوں گی۔

(والله المستعان)

بورڈ آف اسلامک ایجوکیشن
کوٹہ۔ راجستھان

ایک دینی تعلیمی ادارہ بورڈ آف اسلامک ایجوکیشن ... کوٹہ راجستھان میں قائم کیا گیا ہے جس کے تحت اسلامی امتحانات ہندی اور اردو زبان میں لئے جائیں گے جو طلبہ کو اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور اردو زبان و اسلامی تعلیم سے واقف نہیں ہیں انکی آسانی کے لئے یہ بورڈ قائم کیا گیا ہے تاکہ وہ گھر بیٹھے اسلامی تعلیمات اور اردو زبان میں بھی مہارت حاصل کر سکیں اور بچے کیسے امتحانات میں شامل ہو کر سندات حاصل کر سکیں۔

۱۔ ابتدائی اسلامیات فیس ۱/- ۲۔ اعلیٰ اسلامیات فیس ۳/-
۳۔ ماہر اسلامیات ۲/- ۴۔ فاضل ...
۵۔ کامل اسلامیات فیس ۵/-

ان امتحانات کی کتب مدرسہ اور مسلم انجمنیں حاصل کریں، امتحانات میں بچوں کو شامل کرا کر ... امتحانات کا فائدہ اٹھائیں ...

نوٹ: پوری معلومات کے لئے ۵۰ پیسے کا ٹکٹ روانہ فرما کر طلب فرمائیں۔

جنرل سکریٹری
بورڈ آف اسلامک ایجوکیشن کوٹہ راجستھان

فلسطین کا مسئلہ پوری امتِ مسلمہ کا مسئلہ ہے۔

آفاق نظر ندوی

چند دنوں سے ڈاکٹر کسنجر فلسطینیوں کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ اپنی زمینیں فروخت کر کے ان کی مناسب قیمت لے لیں اور اپنے حق سے دست بردار ہو جائیں، حالانکہ یہ فلسطین کے مسئلہ کا کوئی مثبت حل نہیں ہے ——— یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا فلسطینی اور عرب اس سودا پر راضی ہو جائیں گے اور اگر وہ راضی بھی ہو جائیں تو کیا پوری امت مسلمہ جو مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے اس کو قبول کرے گی۔

عربوں کے تمام مسائل کو جو شخص بغور دیکھے گا اسکو یہ بات نظر آئے گی کہ یورپ اور مشرقی سیاستدانوں نے اپنے مکر و فریب سے انھیں بیشتر اس بات پر راضی کر لیا ہے جس کو وہ پہلے ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔

پہلے پہل جب یہودیوں نے فلسطین میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو عرب اس پر راضی نہ ہوئے، انھیں ہر طرح سے روکتے رہے ان کے خلاف ہر ممکن کوشش کرتے رہے لیکن جب امریکی حکومت نے ان پر دباؤ ڈالا تو وہ اس پر راضی ہو گئے کہ یہودیوں کو فلسطین میں رہنے کی اجازت دے دیں۔ لیکن ابھی یہودی نئے آباد ہوئے تھے کہ ان کے پاس نہ تو زمین تھی اور نہ رہنے کے لئے کوئی خاص جگہ۔ وہ زمینیں خریدنا چاہتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ قیمت دینے پر تیار تھے کہ فلسطینی اس پر کسی طرح راضی نہ ہو رہے تھے لیکن پھر کچھ خارجی دباؤ سے اور کچھ اپنی اندرونی پریشانی کی وجہ سے اس پر راضی ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں وہاں یہودیوں نے قوت و اقتدار حاصل کر لیا، وہاں کی اراضی پر قبضہ کر کے امریکہ کی مدد سے اپنی مستقل حکومت قائم کر لی، اور پھر عربوں و اسرائیلیوں کے درمیان ایک ایسی کشمکش اور تناؤ پیدا ہو گیا جو آج تک باقی ہے۔

عرب ابتدا میں بہت زور و شور سے نعرہ بلند کر رہے تھے کہ فلسطین عربی ممالک کا ایک حصہ ہے، یہودیوں نے ظلم و زیادتی سے اس پر قبضہ کر لیا ہے، اسلئے فلسطین عربوں کے ہاتھ میں آ جانا چاہئے، اور یہودیوں کو جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہئے لیکن کچھ دنوں کے بعد [illegible] اسرائیل کی حکومت کو تسلیم [illegible] اور اسی کی حکومت کو ماننے پر تیار ہو گئے [illegible] اب اسرائیلیوں کا مسئلہ صرف یہ [illegible] ایک مستقل حیثیت ہو گئی تھی [illegible] مجبور ہو گئے۔

اس وقت اسرائیل کو ماننے یا نہ ماننے کا مسئلہ درپیش نہیں ہے کیونکہ اسرائیل ایک مستقل حکومت کی شکل میں وجود میں آ چکا ہے، اب اس کے وجود سے انکار کرنا سورج کے جھٹلانے کے مترادف ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس مسئلہ میں صلح ممکن ہے یا نہیں؟ اس کا کوئی حل بھی ہے یا نہیں؟ مصیبت زدہ فلسطینیوں کے لئے کوئی حل نکل سکتی ہے یا نہیں؟

یہ مسئلہ بہت نازک و پیچیدہ ہے اس میں ذرا سی غلطی بھی فلسطینی عوام کے وجود کو ختم کر سکتی ہے، انکی زندگی کو موت سے بدتر بنا سکتی ہے۔ اسلئے تمام عالم کے انصاف و حریت پسند ملکوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس مسئلہ پر غور و فکر کریں، اور کوئی صحیح اور مناسب حل پیش کریں۔

اس کے لئے مناسب شکل یہ ہے کہ اسرائیل اپنی حکومت کے مقررہ حدود میں رہتے ہوئے کسی دوسرے عربی ملک پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کرے، اسی طرح عربوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اسرائیل اور اس کی حکومت کا اعتراف کریں اور ان سے خوشگوار تعلقات رکھیں۔

لیکن اس میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ فلسطینیوں نے خود اپنا ایک مستقل گروہ بنا لیا ہے انھوں نے فدائیوں کی ایک تنظیم بھی بنالی ہے۔ وہ نہایت خود سیاست میں حصہ لینے لگے ہیں اور ان کے نائب عالم عربی ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں پائے جاتے ہیں، انکی بھی یہ خواہش ہے کہ انکی ایک الگ حکومت قائم ہو، مگر موجودہ صورت میں ان کی حکومت کا قیام مشکل ہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ حکومت قائم کرنے کے لئے زمین کی ضرورت پڑتی، لیکن ابھی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی ہے جہاں فلسطینی اپنی علاحدہ حکومت قائم کر سکیں، بعض لوگ غزہ اور مغربی کنارہ کو فلسطینیوں کے لئے پسند کرتے ہیں اور انکا خیال ہے کہ وہ وہیں جا کر اپنی حکومت قائم کر لیں لیکن یہی مشکل یہ ہے کہ [illegible] فلسطینی ایسے ہی [illegible] تو غزہ میں [illegible] اور مغربی کنارہ [illegible] وہاں فلسطینیوں کی حکومت قائم ہونا مشکل ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلسطینیوں کے سامنے کون سی حل پیش کی جائے [illegible] ہی میں واپس لوٹا یا جائے [illegible] پر کبھی راضی نہیں ہو سکتے ہیں۔

یہودیوں کے یہاں [illegible] رہ گیا ہے کہ [illegible] کو اس پر راضی کریں [illegible] ہو جائیں [illegible] ایک طرف [illegible] ذریعہ سے یہ مسئلہ ختم ہو سکتا ہے۔

یہ طریقہ تو بہت ٹھیک اور آسان معلوم ہوتا ہے مگر اس پر عمل کرنا بہت دشوار ہے اسلئے کہ فلسطین میں یہودیوں کے رہنے کا مسئلہ صرف عربوں کا مسئلہ نہیں ہے، اور نہ یہودیوں کے یہاں رہنے میں کوئی قباحت ہے اور نہ انکے حکومت قائم کرنے کا مسئلہ ہے بلکہ سب سے اہم اور ضروری چیز یہ ہے کہ اگر یہودیوں کو فلسطین میں مکمل آزادی مل گئی اور انکی حکومت مضبوط ہو گئی تو وہ ایک دن عالم عربی ہی نہیں عالم اسلامی کے لئے بہت بڑا خطرہ بن جائیں گے۔

اس وقت دنیا کی تمام بڑی طاقتیں یہ چاہتی ہیں کہ مسلمان کمزور اور ذلت و پسپائی میں رہیں، انکی دلی خواہش یہ ہے کہ یہود فلسطین میں مضبوط سے مضبوط طاقت بن جائیں تاکہ عربوں کو دوبارہ ابھرنے کا موقع نہ مل سکے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو اب تک تمام بڑی طاقتیں یہود کی مخالف ہو جاتیں، اور انھیں فلسطین سے نکل جانے پر مجبور کر دیتیں۔

تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ فلسطین عربی ممالک کا ایک حصہ ہے اس پر عربوں ہی کی حکومت ہونی چاہئے اور یہود کو [illegible] میں رہنا چاہئے، اگر وہ [illegible] جاتا ہے تو یہ ان کی زیادتی ہے۔ عرب اس زیادتی و ظلم کے خلاف آواز بلند کریں گے اور ظالم کو وہاں سے ہٹانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

یہودیوں کی یہ کوشش کہ فلسطینیوں کو معاوضہ دیکر ان کی زمینیں لے لی جائیں، یہ ایک ناپاک سازش ہے، اور ان کی مجبوری سے غلط فائدہ اٹھانا ہے۔

ہر فلسطینی مسلمان کو اس کا احساس ہے کہ اگر انہوں نے اپنی زمینیں دشمنوں کے ہاتھ فروخت کی تو اس میں ان کی عزت و آبرو اور انسانیت خطرے میں پڑ جائے گی۔

فلسطینیوں کے اندر جرأت و دلیری کی کمی نہیں ہے۔ وہ سلطان عبدالحمید سے کم حمیت و جرأت مند نہیں ہیں۔ جس طرح سلطان عبدالحمید نے ڈاکٹر ہرتزل سے کہا تھا کہ ڈاکٹر تم اس موضوع پر مجھ سے گفتگو نہ کرو، کیونکہ میں زمین کا ایک بالشت بھی نہیں چھوڑ سکتا ہوں، یہ میری ملکیت نہیں ہے بلکہ اس پر پوری قوم کی ملکیت ہے۔ انہوں نے اسے بچانے کے لئے اپنی جان و مال سب کچھ قربان کر دیا ہے اور اپنے خون سے اس کو سیراب کیا ہے۔ اسی طرح سے آج ہم یہودیوں سے کھلم کھلا کہہ دیں کہ فلسطین کسی فرد کی ملکیت نہیں ہے بلکہ یہ تمام امت مسلمہ کی ملکیت ہے۔ اگر فلسطینی اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں (خدانخواستہ) اس کے باوجود بھی اسکو بچانے کی ذمہ داری پوری امت پر ہوگی۔ اور اگر عرب بھی اس سے [illegible] کر لیں تو پھر بھی امت مسلمہ اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی ہے، یہ مسئلہ چند افراد کا نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کا ہے۔

"تعمیر حیات" کے معاصرین سے ——

ہمیں اس بات پر مسرت ہے کہ "تعمیر حیات" میں شائع کردہ مضامین ہندوستان کے مختلف موقر اخبارات و رسائل میں نقل کئے جاتے ہیں۔ اس قدر افزائی پر ہم شکر گزار ہیں مگر ساتھ ساتھ ہمیں یہ شکایت ہے کہ ہمارے اکثر معاصرین "تعمیر حیات" کا حوالہ نہیں دیتے مزید افسوس اس کا ہے کہ اس صحافتی اصول و روایات کا وہ اخبارات بھی لحاظ نہیں کرتے جو اپنی سنجیدگی، وقار اور معیار میں ممتاز ہیں اور کسی دینی اور سماجی تنظیم کے ترجمان دیکھے جاتے ہیں۔

منیجر "تعمیر حیات"

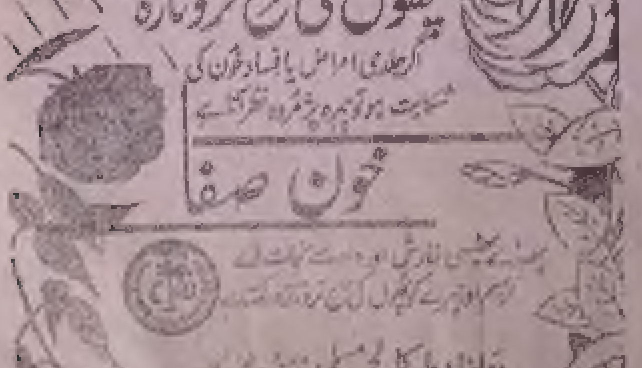

گر تو می خواہی مسلماں زیستن

[illegible] (کوٹہ راجستھان)

"زیستن" کے معنی ہیں یا زندگی بسر کرنا۔ کسی کو جیسے مردہ نہیں کہہ سکتے زندہ کہا جا سکتا ہے۔ جو کوئی موت کے پنجے سے بچ کر محفوظ ہے وہ زندگی رکھتا ہے۔ لیکن لفظ "زیستن" پر بحث طلب ہو گا کہ اگر انہیں معنوں پر قناعت کر لی جائے۔ میرا خیال ہے کہ یہ لفظ ابھی مزید تشریح کا محتاج ہے۔ اقبال

تو برد از روح و تن کو زندگی سمجھا غلط سمجھا

زندہ ہم بھی اپنے آپ کو زندہ سمجھتے ہیں۔ زندگی وہ رکھتے ہیں جس پر دنیا میں جینے کا حق حاصل ہے۔ جو اس دنیا کو سنوارتے ہیں اور جن کے اندر جان ہے، وہ زندگی رکھتے ہیں۔ اور وہ زندہ ہیں، اپنی فطری صلاحیتوں اور قدرتی توانائیوں کو بروئے کار لا کر کائنات پر حاوی ہو چکے ہوں۔ انسانی زندگی کا منشا آفاقی کائنات پر تصرف کرنا ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے کو مسخر کر کے اسے اپنی ماتحتی میں لانا ہے۔ نوع بشری کے علاوہ دیگر تمام مخلوقات سے نامور فرد بہ حیثیت استفادہ کر کے تخلیقی سعادتوں سے بہرہ ور کرتا ہے۔ خدا کے عطا کئے ہوئے منصب خلافت سے مستفیض ہوتا ہے۔ غرض زندگی ہے اپنی حقیقی قوتوں، فطری طاقتوں اور پوشیدہ صلاحیتوں کو ظاہر کرنا۔ اپنی مقدور بھر ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے فرائض متعلقہ کو بجا لانا۔ تمام عمل کی ہمہ گیریوں کے ساتھ تمام مخلوقات کو منشائے تخلیق کی سعادتوں سے بہرہ ور کرنا۔ ہم کہتے ہیں کہ فلاں مرد زندہ ہیں تو فلاں کام کر کے رہیں گے۔ میرے زندہ ہوتے ہوئے فلاں شخص منافقت کی ہمت نہیں کر سکتا۔ زندہ رہنے کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی باطنی و خارجی تمام طاقتوں، تمام رعنائیوں اور تمام قوتوں کے ساتھ زندگی برقرار ہے۔ شکوہ و مجبوری کی زندگی جس ہستی پر ایک بدنما داغ ہے۔ غلامانہ زندگی، زندگی نہیں۔ ہاں قیام روح و تن ضرور ہے۔ یا ایک بے گور و کفن میت ہے جو وسعت زمین پر چلتی پھرتی ہے۔

خداوند تعالیٰ کے اسمائے صفاتی میں سے ایک اسم تو "الحی" ہے جس کے معنی ہیں سدا زندہ ہے۔ فی الحقیقت خدائے برتر اس لفظ کے مفہوم کی تمام ہمہ گیریوں اور وسعت پذیریوں کے ساتھ زندہ ہے۔ زندگی کے مفہوم میں وہ تمام حرکات و سکنات، اعمال و افعال جو زندگی کا احساس پیدا کرنے اور قائم رکھنے سے تعلق میں داخل ہیں۔ زور و قوت، برتری، حمایت، پناہ دہی، طاقتوری، حکمرانی، وغیرہ وغیرہ دیگر تمام امتیازانہ اوصاف زندگی کے مفہوم میں شامل ہیں۔ مخلوقات کے دل و دماغ میں صاحب زندگی کی زندگی سرایت کر چکی ہو۔ وہی زندہ ہے جو دنیا کی زمام حکومت اپنے اختیار میں رکھتا ہے۔ وہی زندگی کا حقدار و خریدار ہے۔ جا طوریا اللہ ہو ہے۔ جس کی ایک جنبش چشم پر اس دنیا کی عبرت و قسمت کا فیصلہ ہے اور خدائے عالم کی تمام و حیثیت اس کی گردش گاہ کو مختصر ہوں۔

بندوں کو خداوند تعالیٰ کے اوصاف میں سے اور اس بات کی کوئی ہدایت نہیں دیا کہ صرف وسعت اور کی وسعت نظری پر دلالت کرتا

ہے بلکہ رب العالمین کی شان ربوبیت کا بہترین مظہر بھی ہے۔ خلاق عالم اپنے بندوں کو ——— ان بندوں کو جن سے اسے ستر گنا زیادہ محبت ہے ——— صرف اسی حد تک مجبور و محکوم رکھنا چاہتا ہے جو نظام کائنات رکھنے کے لئے ضروری ہے ورنہ عطائے اختیارات کے سلسلے میں خود اپنی خلافت عطا کر دینا، یہ اس کی شان رحمانیت سے ممکن ہے۔ اور اس بات کا قطعاً ثبوت کہ انسان دنیا میں جتنا وسعت امکان جو چاہے کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں اور پوشیدہ قوتوں سے خود واقف بھی ہو اور انہیں بروئے کار لانے کی کوشش سے بھی غافل نہ ہو۔ تاریخ عالم ایسے بہت سے انسانوں کو اس قول کی تائید میں پیش کر سکتی ہے جو اپنے وقت میں کوس لمن الملک بجا چکے ہیں۔ تمام مخلوقات کی پیشانی اپنی حرکت پر جھکا چکے ہیں۔ دنیا میں ایک دن ہی تھے جن پر نظام عالم کے قیام و انہدام کا انحصار سمجھا جاتا تھا۔ جن کے ہاتھوں میں ایک عالم کی قسمتوں کے فیصلے تھے۔ غور کیجئے ایسی مثالیں آپ خود تلاش کر سکتے ہیں۔

لیکن انسانی قوتوں اور طاقتوں کا استعمال صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی بلکہ غلط استعمال کا پلڑا زیادہ بھاری ہے کیونکہ فطرتاً انسانی رجحان بدی کی طرف زیادہ مائل ہے۔ اگر کوئی ایسی رکاوٹ نہ موجود ہو جس سے انسانی اختیارات کا استعمال جائز حدود سے آگے نہ بڑھ سکے تو دنیا کے کاروبار بطریق احسن چلتے رہیں گے۔ یہ زمین ہی وہ سب کچھ بن سکے گی جو انسانی آسائشوں کی تمام وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ سکے گی۔ اور اگر انسانی طاقتوں کو من مانی کرنے کی اجازت ہو گی تو قتل و غارتگری کا دور دورہ ہو گا۔ کمزوروں کو طاقتور، مفلسوں کو سرمایہ دار اور محتاجوں کو دولت مند اسی قدر ستائیں گے کہ وہ زندگی کو موت سے بدتر سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ آسمان و زمین میں ہلچل مچ جائے گا۔ اور یہ دنیا اپنی تباہیوں، خونریزیوں، سفاکیوں اور نفس پرستیوں کی وجہ سے ایک جہنم کدہ بن جائے گی بلکہ اس سے بھی زیادہ دردناک مقام اگر کوئی ممکن ہو سکتا ہو ——— اسی لئے [illegible] نے تمام اقتدار اور اختیارات عطا فرما کر اس امر کا بھی انتظام فرما دیا ہے کہ نظام عالم میں تخریبی انقلابات برپا ہو کر اہل جہاں کے امن و آسائش کو تباہ نہ کر سکیں۔ اس کی پیدا کی ہوئی مخلوقات شیطانی قوتوں سے کچلی نہ جا سکے۔ جہاں ایسے تخریبی انقلابات پیدا کئے گئے جنگلی بنیادیں شر و فساد یا خوف الارض پر تھیں فطرت نے شدت گیری کے ساتھ انہیں تعزیری بنا دیا ہیں۔

[illegible] اور خالق [illegible] انسان کے اس جذبہ خود غرضی اور قوت استبداد کو برابر قابو میں رکھنے کے لئے بڑی کارگر تدبیر نکالی ہے جب کہ انسان نہایت خود اپنے دل و دماغ سے [illegible] [illegible] دیگر زبردست و جبار [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اس وقت تک [illegible] [illegible] طاقتوں کا استعمال بطریق جائز

ممکن تھا جبکہ گردش عالم کے [illegible] زمانہ میں اس نے روحانی ہستیوں کی تخلیق فرما کر مخلوقات پر ایک زبردست احسان فرمایا۔ کہ ان کے ذریعہ انسانی ضمیر بیدار و بار ہے۔ ان کی پیروی کے لئے جزا کی بشارت اور مخالفوں کے لئے عذاب الٰہی کی تہدید و تخویف فرمائی گئی۔ انہیں روحانی ہستیوں کو کچھ ضوابط و قواعد، ہدایات و قوانین بھی دئے گئے جن کی پیروی کی جا سکے۔ ان پر اعتبار پیدا کرنے کے لئے انہیں کچھ مافوق الفطرت طاقتیں بھی دی گئیں جن کے مظاہرہ سے انسانی گمراہیوں کی تاریکیاں دور ہو جاتی سکیں۔ ایسے روحانی رہنماؤں کو اسلامی اصطلاح میں پیغمبر ——— ایسے قوانین و ضوابط کو صحائف و [illegible] ——— اور ایسے مافوق الفطرت مظاہرے کو معجزات کہتے ہیں۔ قرآن مجید ایسے ہی قوانین و ہدایات کا جامع دستور العمل ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے روحانیت کے ایک آخری اور جلیل القدر سپہ سالار ہیں۔ قانون مکمل قرآن اقدس ہے اور تشریح مفصل حیثیت قدر ہے۔ ایسی ہدایات خداوندی کے ماتحت اپنے اختیارات کا جائز استعمال اور قوتوں کا صحیح مظاہرہ ہی اسلامی زندگی ہے اور اسی کا نام ہے مسلماں زیستن۔

اب تک بحث سے یہ نتیجہ معقول اخذ کیا جانا چاہیے کہ مسلماں زیستن، مخلوقات کے حق میں دونوں طور پر ضروری اور نظام عالم کو تخریبی تغیرات سے محفوظ رکھنے کے لئے یقیناً لازمی ہے۔ اور "مسلماں زیستن" بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ خداوندی اور قوانین کبریائی پر پابندی قائم کی جائے اور اپنی زندگی کو صبغۃ اللہ میں رنگ دیا جائے۔ اس ضابطہ حیات کی پیروی کی جا چکی ہے، اور پیروی کرنے والوں کو انعام خداوندی سے نوازا بھی جا چکا ہے۔ اس خدائی قانون کے پیروکاروں نے بڑی بڑی طاقتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ انھوں نے بڑے بڑے فرعونوں کو زندگی کا مزہ چکھا دیا۔ اور اللہ کی رحمتوں اور اللہ کے انعام و عطیات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کو حقیقی رحمتوں سے زندگی کا خلعت فاخرہ پہنا دیا۔

آج بھی خدا زندہ ہے۔ اس کا قانون زندہ ہے۔ اس کا وعدہ زندہ ہے۔ پھر وہی فرمانبرداری کر سکتا ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو پھر دہرا سکتی ہے بشرطیکہ مسلمان پھر زندہ ہو جائیں اور وہ زندگی کے مقاصد و مطالب کو سمجھیں۔

میں نے اس مضمون کے عنوان میں جو فقرہ لکھا ہے وہ قواعد کے لحاظ سے ناکمل اور اپنے مفہوم کے لحاظ سے ادھورا ہے۔ فی الحقیقت یہ ایک شعر کا مصرعہ اولیٰ ہے۔ اس تشریح کے بعد اب مصرعہ ثانی درج کرتا ہوں جو یقیناً اور اس کی سچائی کا دل و دماغ سے اعتراف کیجئے

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

"اگر یہ جذبہ انسانوں میں نہ ہوتا تو تمدن و سائنس کی ترقی نہ ہوتی، ادب و شاعری کو غذا نہ ملتی"

[illegible]

خاص عوامل اور انکے ارتقاء کا نتیجہ

[illegible] ادب و شاعری کو بھی اس سے غذا ملتی ہے۔

انسان کے اندر بڑا بننے کا جذبہ فطری ہے، اسکے اندر مسابقت کا جذبہ طبعی طور پر ہے [illegible] ادب، شاعری و فلسفہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

دو چیزیں قابل شکایت اور قابل فکر

[illegible]

انگریز قابض تھے ان کو اس ملک پر قبضہ کرنے کا کیا حق تھا جو لوگ اس کے خلاف برسرپیکار ہوئے وہ ایک نہایت مقدس فرض ادا کرنے کے لئے اٹھے تھے [illegible] علامہ اقبال نے فرمایا ہے

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انسان کی قبا چاک

[illegible]

اجتماعی مفاد نظرانداز

[illegible]

Regd. No. L 1981 FORTNIGHTLY Phone : 22948

TAMEER-E-HAYAT

Darululoom Nadwatululama, Lucknow (India)

روس اور امریکہ کے درمیان تیل کی پیداوار میں زبردست مقابلہ ـــــ تاہم دونوں مشرق وسطی کے محتاج۔

حفظ الرحمٰن اعظمی ندوی

امریکی رسالہ یو ایس اے نیوز اینڈ ورلڈ کے رپورٹروں نے ماسکو اور واشنگٹن کے باوثوق حوالے سے یہ اطلاع دی ہے کہ امریکہ کی طرح روس بھی جو کہ توانائی کی پیداوار میں بہت آگے ہے اور پٹرول کی پیداوار میں امریکہ کے مقابل ہے پٹرول کے شدید بحران سے دوچار ہوگا اور روس و امریکہ کے مابین مشرق وسطی کے پٹرول کے بارے میں ٹکراؤ کا اندیشہ ظاہر کیا ہے لیکن یہ خبر بظاہر درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ روس امریکہ سے زیادہ پٹرول، قدرتی گیس اور کوئلے کی دولت سے مالا مال ہے مزید یہ کہ روس میں پٹرول کی پیداوار میں برابر اضافہ ہو رہا ہے پہلے امریکہ سے بہت کم پٹرول نکلتا تھا لیکن اب تیل کی پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اندازہ ہے کہ سال رواں کے آخر تک امریکہ سے زیادہ پٹرول پیدا کرنے لگے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ روس واحد ملک ہے جس کی توانائی سے ملک کی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں لیکن مبصرین کا خیال ہے کہ یہ صورت حال ہمیشہ برقرار نہیں رہے گی بلکہ بہت جلد اس میں تغیر رونما ہوگا، پٹرول کی پیداوار کے جو نشانے روس میں مقرر ہیں ان کا پورا کرنا دشوار نظر آ رہا ہے۔ روسی ماہرین کا جدید استعمال ہونے والے سامان کی بکثرت تیار کرنے کا جو منصوبہ ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ توانائی کی پیداوار میں شدید اضافہ کی ضرورت ہوگی کیونکہ ٹیلی ویژن، ریفریجریٹر، بجلی سے گرم ہونے والی مشینیں اور بجلی کے جھاڑو وغیرہ جیسے جدید سامان کے استعمال پر اچھی خاصی مقدار میں توانائی کا استعمال ہوگا۔

روس میں کثیر توانائی کے استعمال کا دوسرا خاص سبب یہ ہے کہ روس کاریں اور ٹرک جدید تکنالوجی کے ذریعہ تیار کرنے میں بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے ان کاروں اور ٹرکوں کے کارخانوں سے باہر آتے ہی پٹرول کا خرچ ہونے لگے گا۔ یاد رہے کہ امریکہ میں کاریں سب سے زیادہ پٹرول استعمال کرتی ہیں۔

روس میں پٹرول کا انکشاف ۱۹۳۰ء میں ہوا ہے ان ہی دنوں امریکہ میں بھی پٹرول کا انکشاف ہوا تھا اسی کے باوجود روس کے پٹرول کی پیداوار دس لاکھ پیپے یومیہ تیسری دہائی میں جا کر ہوئی پھر پانچویں دہائی کے آخر میں چار گنا تک کا اضافہ ہو گیا اور چھٹی دہائی میں بھی اضافہ ہوا اور چھ فیصد سالانہ کے حساب سے برابر اضافہ ہوتا رہا یہاں تک ۱۹۷۵ء کے آخر میں ۱۰۰۰ ملین پیپے یومیہ پٹرول نکالا جانے لگا، اور اسی اثناء میں امریکہ کے پٹرول کی پیداوار میں کمی ہوتی رہی، ۱۹۷۰ء میں ۹۰۰ ملین پیپے یومیہ پٹرول سے گھٹ کر گزشتہ سال ۸۰۰ ملین پیپے یومیہ ہو گیا۔

روس اپنے پٹرول کی پیداوار کے مقررہ نشانے تک پہنچنے میں ناکام رہا ہے ـــــ نویں پنجسالہ منصوبہ میں تیل کی پیداوار کا اندازہ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک ۵ لاکھ، مزید پیپے یومیہ تھا، لیکن یہ مقدار پہلے تین سالوں میں پوری نہ ہو سکی بلکہ ۵۰۰ ہزار پیپے کی کمی واقع ہوگئی۔

ایک مغربی ماہر کا کہنا ہے کہ روسیوں نے اس صدی کی پانچویں دہائی میں کم گہرائی میں پائے جانے والے پٹرول نکال کر بہت دولت حاصل کی لیکن جو مقدار جلد ہو سکا پٹرول نکال کر کنویں چھوڑ دئے۔ اب اس وقت جو پٹرول نکل رہا ہے پانی میں ملا ہوا نکلتا ہے مجبوراً روسیوں نے مغربی سائبیریا اور وسطی ایشیا کا رخ کیا لیکن قلیل گہرائی سے پٹرول نکالنے والے آلات اور مشینیں مغربی سائبیریا کے کنوؤں میں کام نہیں آ سکتیں کیونکہ اس علاقہ میں پٹرول بہت گہرائی میں پایا جاتا ہے اس وجہ سے روسیوں کو گہرائی سے پٹرول نکالنے کے لئے خاص مشینوں کی ضرورت ہے جنکے حصول کے لئے روسیوں کو امریکہ کی طرف دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔

سائبیریا کے تیل کے کنوؤں سے تیل نکالنا شروع ہو گیا ہے۔ ۵۰۰ فٹ گہرائی سے ۲۰۰۰ فٹ کی گہرائی تک سے تیل نکالا جاتا ہے بعض ماہرین طبقات الارض کا کہنا ہے کہ اس علاقہ کے بڑے رقبہ میں تیل کثیر تعداد میں موجود ہے لیکن انکے نکالنے میں بہت محنت اور دشواری سے کام لینا پڑے گا، روس کی ان مشکلات کے باوجود مغربی ماہرین کا کہنا ہے کہ سائبیریا روس کیلئے ایک نعمت ثابت ہوا ہے اس صدی کی چھٹی دہائی میں اس علاقہ سے تیل نکلنا شروع ہوا اور بہت سرعت سے ۱۹۷۵ء کے آخر تک ۱۰۰ ملین پیپے یومیہ تیل کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔

سائبیریا کا وسطی اور مشرقی علاقہ پٹرول سے مالا مال ہے جس سے ابھی پٹرول نہیں نکالا جا رہا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ روس کے پاس محفوظ تیل امریکہ سے دوگنا ہے۔

روس نے تیل برآمد کرنے والے ممالک کی طرح اپنے پٹرول کی قیمت میں چار گنا اضافہ کر دیا ہے اور پٹرول کی بڑی مقدار مشرقی یورپ کے حلیف ممالک کو سپلائی کر رہا ہے۔ مشرقی یورپ کے ممالک اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے روس سے ۸۰۰۰۰ فیصد پٹرول حاصل کرتے ہیں صرف رومانیہ اس سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے جسکے پاس پٹرول کی پیداوار ہے۔ روس اپنے کثیر پٹرول کی پیداوار کے باوجود غیر ممالک سے بڑی مقدار میں پٹرول خریدنے پر مجبور ہوا ہے تاکہ مشرقی یورپ میں اپنے حلیف ممالک کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ جدید اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ روس نے ۱۹۷۵ء میں پانچ کروڑ پیپے پٹرول خریدا ہے جسمیں اکثر مشرق وسطی سے حاصل کیا ہے۔ عرب ممالک کے تیل کی قیمت میں اضافہ کرنے کی وجہ سے روس پر اچھا خاصا اثر پڑا ہے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ روس نے بعض حالات میں مشرق وسطی سے پٹرول زیادہ قیمت پر خرید کر کم قیمت میں اپنے حلیف ممالک کو دیا ہے کیونکہ انکے مشرقی یورپ کے ممالک کے ساتھ سیاسی اور فوجی اسباب کی بنا پر جو تعلقات ہیں روس انکے تعاون کرنے سے اپنا ہاتھ نہیں کھینچ سکتا اگرچہ اسے زیادہ مصارف برداشت کرنے پڑیں۔

امریکی کمپنیوں کا سائبیریا کے تیل کے کنوؤں میں کافی اہتمام کیا تھا لیکن جب روس نے عرب ممالک کی امریکہ پر تیل کی بندش کی وجہ سے تائید کی تھی اس وقت سے امریکیوں کی توجہ یہاں سے ہٹ گئی۔

اگر امریکہ نے روس سے بے اعتنائی کی تو روس سے ان دونوں بڑی طاقتوں میں تعلقات کشیدہ ہو جائیں گے اور روس مشرق وسطی اور خلیجی ممالک سے پٹرول لینے پر مجبور ہو جائے گا خواہ اسے اس کے حصول کے لئے طاقت کا استعمال کرنا پڑے۔

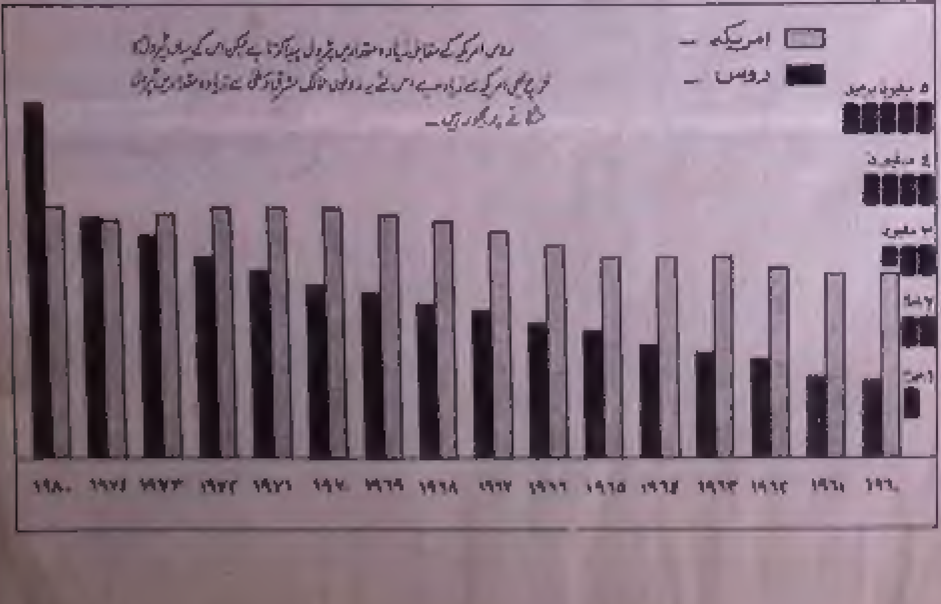
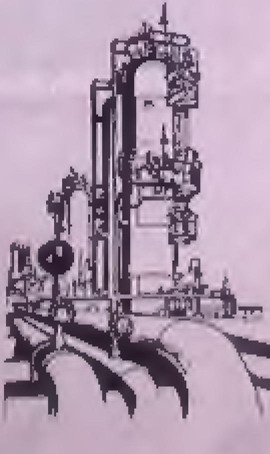
روس امریکہ کے مقابلہ زیادہ مقدار میں پٹرول پیدا کرتا ہے لیکن اس کے یہاں پٹرول کا خرچ بھی امریکہ سے زیادہ ہے اس لئے یہ دونوں ممالک مشرق وسطی سے زیادہ مقدار میں پٹرول منگانے پر مجبور ہیں۔